ISSN: 2321-8339

جولائی ۔ ستمبر ۲۰۱۶ء

ادارہ تحقیق وتصنیف اسلامی کا ترجمان

سہ ماہی

تحقیقاتِ اسلامی

علی گڑھ

صلاحیتوں کو پہچاننے اور ترقی دینے کی ضرورت

سید جلال الدین عمری

شبلی کی سیرت نگاری کا تنقیدی جائزہ

پروفیسر محمد انس حسان

فیوض الحرمین ۔ ایک مطالعہ

مولانا کلیم صفات اصلاحی

توحید خالص کا تصور ۔ صحف سماوی میں

جناب محمد افضل

مسلم دور حکومت کے علماء و صوفیہ اور دعوتِ دین

ڈاکٹر محمد شمیم اختر قاسمی

مولانا فراہیؒ کی تصنیف 'جمهرة البلاغة'

ڈاکٹر احمد مطلوب / ابوسعد اعظمی

تعارف وتبصرہ

پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی

ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی

ادارۂ تحقیق و تصنیفِ اسلامی کا ترجمان

سہ ماہی

تحقیقاتِ اسلامی

علی گڑھ

جولائی ـــــــــــــ ستمبر ۲۰۱۶ء

مدیر

سیّد جلال الدین عمری

معاون مدیر

محمد رضی الاسلام ندوی

نبی نگر (جمال پور)، پوسٹ بکس نمبر ۹۳، علی گڑھ ــ ۲۰۲۰۰۲

ISSN: 2321-8339

سہ ماہی تحقیقاتِ اسلامی علی گڑھ

جلد: ۳۵ شمارہ: ۳

شوال ——— ذی الحجہ ۱۴۳۷ھ

جولائی ——— ستمبر ۲۰۱۶ء

- مجلہ کے تمام شمارے www.tahqeeqat.net پر لوڈ کر دیے گئے ہیں۔
- مقالہ نگار حضرات اپنے مقالات صرف tahqeeqat@gmail.com پر ارسال کریں۔
- انتظامی امور سے متعلق رابطہ کے ذرائع:

فون: 0571-2902034 موبائل: 08126677681
ای میل: idaratahqeeq2016@gmail.com

زرِ تعاون

اندرونِ ملک

فی شمارہ	۴۰ روپے
سالانہ	۱۵۰ روپے
پانچ سال کے لیے	۶۰۰ روپے
سالانہ (لائبریریاں و ادارے)	۲۰۰ روپے

برائے پاکستان

سالانہ (انفرادی)	۲۰ امریکی ڈالر
سالانہ (ادارے)	۲۵ امریکی ڈالر

برائے دیگر ممالک

سالانہ (انفرادی)	۲۵ امریکی ڈالر
سالانہ (ادارے)	۳۰ امریکی ڈالر

طابع و ناشر سید جلال الدین عمری نے بھارت آفسیٹ دہلی ــ ۶ سے چھپوا کر

ادارۂ تحقیق و تصنیفِ اسلامی، نبی نگر (جمال پور)، علی گڑھ سے شائع کیا

فہرست مضامین

حرف آغاز

تحقیق وتنقید

بحث ونظر

ترجمہ وتلخیص

تعارف وتبصرہ

اس شمارے کے لکھنے والے

۱۔ پروفیسر محمد انس حسان

گورنمنٹ ڈگری کالج، جہانیاں (پاکستان)

anskashmiri@gmail.com

۲۔ مولانا کلیم صفات اصلاحی

رفیق دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ

۳۔ جناب محمد افضل

لیکچرر گورنمنٹ شاہ حسین کالج، ٹاؤن شپ، لاہور (پاکستان)

ranaafzalpu@gmail.com

۴۔ ڈاکٹر محمد شمیم اختر قاسمی

سابق صدر شعبۂ دینیات، عالیہ یونی ورسٹی، ۲۱۔حاجی محمد محسن اسکوائر، کولکاتا (انڈیا)

mohdshamimakhterqasmi@yahoo.com

۵۔ ڈاکٹر احمد مطلوب

جنرل سکریٹری، المجمع العلمی العراقی، بغداد

۶۔ جناب ابوسعد اعظمی

ریسرچ اسکالر، شعبۂ عربی، علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ

anislahi@gmail.com

۷۔ پروفیسر ظفرالاسلام اصلاحی

سابق صدر شعبۂ اسلامک اسٹڈیز، علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ

zafarul.islam@gmail.com

۸۔ ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی

سکریٹری تصنیفی اکیڈمی جماعت اسلامی ہند

mrnadvi@gmail.com

۹۔ سید جلال الدین عمری

صدر ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی علی گڑھ

حرف آغاز

صلاحیتوں کو پہچاننے اور ترقی دینے کی ضرورت

سید جلال الدین عمری

جماعت اسلامی ہند کی حالیہ میقات (اپریل ۲۰۱۵ء تا مارچ ۲۰۱۹ئ) میں ایک نیا مرکزی شعبہ Department of Human Resource Development کے نام سے قائم کیا گیا ہے۔ اس کا مقصد ہے افراد کی صلاحیتوں کو پہچاننا اور انہیں ترقی دینے کے مواقع فراہم کرنا۔ حلقوں کی سطح پر بھی یہ شعبہ قائم کیا گیا ہے اور اس کے ذمے دار متعین کیے گئے ہیں۔ مؤرخہ ۱۷۔ ۱۸/ اکتوبر ۲۰۱۵ء میں حلقوں کے ذمہ دارانِ شعبہ کا ایک تربیتی کیمپ مرکز جماعت میں منعقد ہوا تھا۔ اس کے افتتاحی اجلاس میں مولانا سید جلال الدین عمری امیر جماعت اسلامی ہند نے جو تقریر کی تھی، اسے افادۂ عام کے لیے موصوف کی نظر ثانی کے بعد یہاں پیش کیا جارہا ہے۔ (رضی الاسلام)

الحمد لله رب العالمین۔ والصلاۃ والسلام علی سید المرسلین۔ وعلی آله وأصحابه أجمعین۔ ومن تبعهم باحسان الی یوم الدین۔ اما بعد!

محترم ذمہ دارانِ جماعت اور عزیز رفقائے مجلس! میں آپ تمام حضرات کا مرکز جماعت اسلامی ہند میں خیر مقدم کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ جس مقصد کے لیے ہمارا یہ کیمپ رکھا گیا ہے وہ پورا ہو۔ آمین!

عزیز دوستو! ہم سب جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر بہت سی صلاحیتیں رکھی ہیں، اسے غیر معمولی قابلیتوں سے نوازا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ دنیا میں

جن لوگوں نے بڑے بڑے کام انجام دیے ہیں، انھوں نے بھی صحیح معنوں میں اپنی تمام صلاحیتوں کا استعمال نہیں کیا۔ بعض ہی صلاحیتیں ان کی روبہ عمل آئیں، بعض صلاحتیں دب کر رہ گئیں یا ان کو ابھرنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو صلاحیتیں دی ہیں، اس کی ذمہ داری ہے کہ ان صلاحیتوں سے واقف ہو اور ان کو اس کی مرضی کے مطابق استعمال کرے۔ یہ صلاحیتیں اللہ تعالیٰ کی نعمت ہیں۔ اس پر ہمیں اس کا شکر گزار ہونا چاہیے۔ ارشاد ہے:

وَاللّٰہُ أَخْرَجَكُم مِّن بُطُونِ أُمَّهٰتِكُمْ لاَ تَعْلَمُونَ شَیْئاً وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالأَبْصَارَ وَالأَفْئِدَةَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ (النحل:۷۸)

''اللہ نے تم کو تمھاری ماؤں کے پیٹوں سے اس طرح پیدا کیا کہ تم کچھ نہیں جانتے تھے۔ اس نے تمھیں کان دیے، آنکھیں دیں اور دل عطا کیا، تاکہ تم اس کا شکر ادا کرو''۔

یہ دنیا کیا ہے؟ کس نے پیدا کی ہے؟ اس کے مسائل کیا ہیں؟ اس میں ہماری حیثیت کیا ہے؟ ہم یہاں کیا کر سکتے ہیں؟ ان تمام چیزوں سے ہم بے خبر تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں غور وفکر کی، سوچنے سمجھنے کی جو صلاحیتیں عطا فرمائی ہیں، وہ اس لیے ہیں، تاکہ ہم ان کے ذریعہ اس بے خبری کو ختم کریں۔ دنیا میں بے خبر ہو کر آئے ہیں، لیکن بے خبر ہو کر نہ رہیں، اپنے مقصدِ حیات سے واقفیت حاصل کریں۔ اگر ہم ان صلاحیتوں کو صحیح طریقہ سے استعمال کریں گے تو ان میں اضافہ ہوگا اور ہم بے خبری اور جہالت کی زندگی نہیں گزاریں گے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو بہت سے صلاحیتیں عطا فرمائی ہیں، لیکن تین (۳) صلاحیتوں کا تذکرہ قرآن مجید میں بار بار آیا ہے: سننے کی صلاحیت، دیکھنے کی صلاحیت اور غور وفکر کرنے کی صلاحیت۔ ہم سب جانتے ہیں کہ انسان کے لیے علم کے جو ذرائع ہیں، ان کا تعلق بیش تر انھی تین چیزوں سے ہے۔ انسان بہت سی چیزوں کو دیکھ کر سمجھتا ہے، ایک بڑا حصہ وہ ہے جس کو سن کر جانتا ہے اور پھر دل و دماغ کے

ذریعے ان سے نتائج اخذ کرتا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

اقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ۔ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ (العلق: ۳۔ ۴)

''پڑھو، تمارا رب بڑا برتر ہے، جس نے تمھیں قلم کے ذریعے علم سکھایا''

یہ گویا علم کی بنیاد ہے۔ شروع ہی میں کہہ دیا گیا کہ اللہ کے نام سے اس کا آغاز ہو۔ ایک طرف اس میں یہ بات کہی گئی کہ پڑھو اللہ کے نام سے۔ ظاہر ہے، اس کا تعلق انسان کے مطالعہ سے ہے۔ اس کے بعد دوسری بات یہ فرمائی کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو قلم کی نعمت دی، یعنی قلم کے ذریعہ اسے تعلیم دی۔ قرآن مجید میں قلم کے تعلق سے بہت سی باتیں کہی گئی ہیں۔ یہاں جو بات کہی گئی ہے وہ یہ ہے کہ انسان پر اللہ تعالیٰ کا ایک احسان یہ بھی ہے کہ اس کو صرف پڑھنا ہی نہیں سکھایا، بلکہ قلم کی طاقت بھی دی ہے۔ جب قرآن مجید نازل ہو رہا تھا، اس وقت کسی درجے میں انسان قلم کے استعمال سے واقف ہو چکا تھا۔ اسلام آنے کے بعد اس میدان میں اور زیادہ ترقی ہوئی اور اسے اسلام نے بہت اعلیٰ مقام تک پہنچا دیا۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو قوتِ گویائی عطا کی ہے، وہ اپنا مافی الضمیر بیان کرسکتا ہے، جذبات و احساسات کو بھی بڑی حد تک الفاظ کی شکل دے سکتا ہے، اصحابِ فکر اور سوچنے سمجھنے والے افراد اپنے افکار و خیالات پیش کر سکتے ہیں اور پیش کرتے رہے ہیں۔ اس پر بحث و مباحث بھی ہوتا رہا ہے، لیکن انھیں محفوظ رکھنے کا طریقہ اسے معلوم نہیں تھا کہ ان سے ان کے مخاطب بھی استفادہ کریں اور آئندہ نسلیں بھی اس سے فائدہ اٹھاسکیں۔ قلم کے ذریعہ اس نے اس کا طریقہ سیکھا اور علم وفن کی تاریخ وجود میں آئی۔ یہ دنیائے علم کا بڑا انقلاب تھا۔

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو صرف پڑھنے کی نعمت نہیں عطا کی، بلکہ انہیں قلم کی دولت سے بھی نوازا۔ یہ اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں پر بڑا احسان ہے۔ زبان اور قلم فروغِ علم کے یہی دو ذرائع ہیں جنھیں اب تک انسان استعمال کرتا رہا ہے۔ اب پڑھنے لکھنے کے نئے نئے طریقے وجود میں آگئے ہیں۔ کمپیوٹر اور دوسرے جدید

آلات کے ذریعہ تعلیم اور تعلّم کا سلسلہ جاری ہے۔لیکن بہر حال اصلاً یہی دو ذرائع ہیں جن سے آدمی پڑھے گا یا پڑھائے گا، یا اپنی چیزوں کو دوسروں تک منتقل کرے گا۔ اسی سے ہمیں معلوم ہوگا کہ ماضی میں کیا ہوتا رہا ہے؟ اب کیا ہو رہا ہے؟ اور آئندہ کیا ہوسکتا ہے؟

یہ ایک واقعہ ہے کہ اس دنیا میں ہر انسان کچھ مخصوص صلاحیتیں لے کر پیدا ہوتا ہے۔مثلاً ذہانت وفطانت کو لیجئے۔ بچپن ہی سے اندازہ ہوتا ہے کہ کون ذہنی طور پر تیز اور معاملہ فہم ہے اور کون نسبتاً کم فہم اور کند ذہن؟ کس کا حافظہ اچھا ہے اور کس کی یادداشت کم زور ہے؟ بعض لوگوں میں خدمت کا جذبہ ہوتا ہے۔ وہ دوسروں کے اوپر خرچ کرتے اور اپنا مال لٹاتے ہیں۔ ہر ایک کے اندر یہ حوصلہ نہیں ہوتا۔ بہت سے لوگوں کے پاس مال بھی ہوتا ہے، وسائل بھی ہوتے ہیں، لیکن وہ دوسروں پر خرچ کریں، یہ ضروری نہیں ہے۔بعض لوگ تو ایسے ہوتے ہیں جو اپنے اوپر بھی خرچ نہیں کرتے۔ اس طرح کی کم زوری ان کی فطرت ہوتی ہے۔خوبیاں اور خامیاں فطری ہوتی ہیں اور وراثت میں ملتی ہیں۔ ان پر قادر ہونا دشوار ہوتا ہے۔

انسان کے اندر جو مخصوص صلاحیتیں پائی جاتی ہیں ان کو جاننا، پہچاننا اور صحیح رخ دینا ایک بہت بڑا کام ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے اسی بات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ایک حدیث میں آتا ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

> **الناس معادن کمعادن الذھب و الفضۃ، خیارھم فی الجاھلیۃ خیارھم فی الاسلام اذا فقھوا** (مشکوٰۃ بہ حوالہ مسلم)
>
> ’’لوگوں سونے چاندی کی کانوں کے مثل ہیں۔ عہد جاہلیت میں کسی کے اندر کوئی خوبی رہی ہے تو وہ اسلام قبول کرنے کے بعد بھی باقی رہے گی‘‘۔

اس حدیث میں اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا ہے کہ جو لوگ جاہلیت میں بہتر تھے اور جن صلاحیتوں اور خوبیوں کے مالک تھے، وہ ان خوبیوں اور صلاحیتوں

کے ساتھ اسلام میں آئیں گے۔ یہاں آنے کے بعد اگر وہ دینی بصیرت بھی اپنے اندر پیدا کرلیں تو اس سے دین کو فروغ ملے گا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ صلاحیتیں انسان کے اندر فطری طور پر ہوتی ہیں، اسے چاہیے کہ ان کو محسوس کرے اور دین کی خدمت کے لیے انہیں استعمال کرنے کی کوشش کرے۔

اسی کے ساتھ یہ بات بھی کہی گئی ہے کہ تعلیم و تربیت سے انسان کی صلاحیتوں کو موڑا جاسکتا ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفاً فِطْرَةَ اللهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لاَ تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللهِ ذَلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لاَ يَعْلَمُوْنَ (الروم: ۳۰)

''اپنا رخ اللہ کی طرف کرو یکسوئی کے ساتھ۔ یہ اللہ تعالیٰ کی فطرت ہے، جس پر اس نے انسان کو پیدا کیا ہے۔ اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی۔ یہی دین قیم ہے۔''

حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان اپنی صحیح فطرت سے ہٹ بھی جاتا ہے، اس میں اس کے والدین کی غلط تعلیم وتربیت کا دخل ہوتا ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:

ما من مولودٍ الاّ یولَد علی الفطرۃ، فأبواہ یھوّدناہ أوینصّرانہ أو یمجّسانہ۔ (بخاری ومسلم)

''ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے، بعد میں اس کے ماں باپ اسے یہودی، نصرانی یا مجوسی بنادیتے ہیں۔''

توحید کا عقیدہ، شرک سے بیزاری، اللہ کی اطاعت کا جذبہ، یہ تمام چیزیں انسان کی فطرت میں داخل ہیں۔ لیکن ہوتا یہ ہے کہ اس کے والدین اسے فطرتِ اسلام سے ہٹادیتے ہیں اور یہودی، نصرانی یا مجوسی بنادیتے ہیں۔ اس سے واضح ہے کہ خاندان، ماحول، روایات، تعلیم وتربیت کے ذریعہ وغیرہ سے انسان کو صحیح رخ بھی ملتا ہے اور غلط رخ بھی۔ جولوگ غلط رخ پر جارہے ہیں، اس کی بنیادی وجہ یہی ہے

کہ ان کو اسی طرح کا ماحول ملا ہے، گھر کا ماحول اسی طرح کا ہے، والدین اسی طرح کے ہیں، اسکول اسی طرح کا ہے اور پوری فضا اسی طرح کی ہے تو ظاہر سی بات ہے کہ ان کا رخ بھی غلط ہو جاتا ہے۔ یہ حدیث صاف طور پر بتاتی ہے کہ فطرت سے انحراف انسان کے اندر اس لیے ہوتا ہے کہ والدین اسے غلط رخ پر لے جاتے ہیں۔

موجودہ دور نے علم کے میدان میں بڑی ترقی کی ہے اور اس کے نئے نئے شعبے کھلے ہیں۔ لیکن آج کے طرزِ تعلیم کا نقص یہ ہے کہ اس میں طالب علم کے ذہن و مزاج، رجحانِ طبع اور صلاحیت کو نہیں، بلکہ مارکیٹ کی ضرورت اور تقاضوں کو سامنے رکھا جاتا ہے۔ پوری دنیا میں یہی رجحان غالب ہے کہ مارکیٹ کی جو ضرورت ہے، تعلیم و تربیت کے ذریعہ اس ضرورت کو پورا کرنا چاہیے۔ مثال کے طور پر بہت سے بچوں کا فطری رجحان سوشل سائنس کی طرف ہو سکتا ہے، لیکن آج ڈیمانڈ ہے فزیکل سائنس کی، تو بچے کو اس میں لگا دیا جاتا ہے۔ اس طرح ایک بچہ، جو بڑا ادیب بن سکتا تھا، معاشیات کا ماہر ہو سکتا تھا، میدانِ سیاست کا رہنما بن کر ابھر سکتا تھا، وہ ڈاکٹر اور انجینیر بن گیا۔ اس لیے کہ ہم نے یہ نہیں دیکھا کہ اس کے اندر کیا صلاحیت ہے؟ لیکن جن لوگوں کو اپنی فطری صلاحیتوں کو پروان چڑھانے اور اپنے مزاج کے لحاظ سے کام کرنے کے مواقع مل جاتے ہیں وہ بہت تیزی سے آگے بڑھتے ہیں اور خوب ترقی کرتے ہیں۔

اس لحاظ سے میرا خیال ہے کہ جماعت اسلامی ہند میں یہ اپنی نوعیت کا پہلا کیمپ ہے۔ اس کے ذریعہ، امید ہے کہ ہم یہ دیکھنے کی کوشش کریں گے کہ ہمارے وابستگان میں جو صلاحتیں ہیں ان کو کس طرح ڈیولپ کیا جا سکتا ہے؟ اور مطلوبہ نتائج کیسے حاصل کیے جا سکتے ہیں؟ ظاہر ہے کہ یہ ہمارا پہلا قدم ہے۔ ابھی پورے وثوق کے ساتھ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس کے کیا نتائج حاصل ہوں گے؟ تجربہ ہی سے معلوم ہوگا کہ کیا ہم اپنے رفقاء کی مخصوص صلاحیتوں کو ابھارنے اور ان کو دینی رخ دینے میں کس حد تک کامیاب ہو پا رہے ہیں؟ اگر ہم اس شعبہ (Human Resource Development) کے ذریعے، ہماری جو علمی، فکری اور عملی

ضرورتیں ہیں، ملک وملت کی جو ضرورتیں ہیں، بلکہ عالمی سطح پر جو ضرورتیں ہیں، ان کے لیے کچھ افراد تیار کرسکیں، ان کو دینی رخ دے سکیں اور ان کے ذہنوں کو موڑ سکیں تو یہ بہت بڑی کام یابی ہوگی۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک طویل عمل ہے اور اس کے نتائج کی فوری طور پر توقع بھی نہیں کی جاسکتی، بلکہ یوں کہا جاسکتا ہے کہ یہ ایک مثبت آغاز ہے۔ اگر کوشش جاری رہے تو راہیں کھل سکتی ہیں۔

لوگوں کی صلاحیتوں کو پہچاننا اور ان کو وہ رخ دینا جو مطلوب ہے، کوئی آسان کام نہیں ہے۔ جماعت اسلامی ہند نے اپنے قیام کے بعد ہی سے اس کی سعی کی ہے، اس کے نتیجے میں رام پور میں ثانوی درس گاہ کا قیام عمل میں آیا، جس میں جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں کو علومِ دین سے آراستہ کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس سے بعض نمایاں علمی شخصیتیں ابھریں۔ ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی کا قیام بھی اسی مقصد سے ہے، جو ایک طویل عرصہ سے علمی خدمات انجام دے رہا ہے اور نئے افراد کو اس کے لیے تیار بھی کر رہا ہے۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی اسلامی اکیڈمی ہے، جو نئی نسل کو فکری لحاظ سے دین کی خدمت کے لیے تیار کر رہی ہے۔ اب ہم Human Resource Development شعبہ کے ذریعہ افراد کی صلاحیتوں کو فروغ دینے اور علم وفکر کے مختلف میدانوں میں ان کی رہ نمائی اور تعاون کا کام کرنا چاہتے ہیں۔ اگر ہم اس میں کام یاب ہوئے تو توقع ہے کہ بہتر نتائج حاصل ہوں گے۔ اس کے لیے شعبہ کو غیر معمولی سعی کرنی ہوگی۔ اللہ تعالیٰ مدد فرمائے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

وقت کے ایک اہم اور زندہ موضوع پر قابلِ قدر تصنیف

غیر مسلموں سے تعلقات اور ان کے حقوق

مولانا سید جلال الدین عمری

مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان کیسے تعلقات ہونے چاہئیں ؟ یہ آج کا ایک اہم اور زندہ موضوع ہے۔ کیا اسلام اپنے ماننے والوں کے علاوہ دوسروں کو بنیادی انسانی حقوق سے محروم کر دیتا ہے؟ کیا اس میں مذہبی رواداری، تحمل وبرداشت اور توسع نہیں پایا جاتا ہے؟ اسلام کے نزدیک غیر مسلموں سے خاندانی، معاشرتی، سماجی، کاروباری اور ازدواجی تعلقات کی نوعیت کیا ہے؟ غیر مسلموں کو سلام، مساجد میں ان کا داخلہ اور ان سے تحائف کے تبادلہ کا کیا حکم ہے؟ کیا مسلمانوں کے معاملات میں ان کی گواہی قبول کی جاسکتی ہے؟ اسلامی ریاست کی بنیادیں کیا ہیں؟ اور اس پر کیا اعتراضات کیے جاتے ہیں ؟ جہاد کیا ہے اور اس کے احکام کیا ہیں؟ ذمیوں کے کیا حقوق ہیں؟ اسلامی ریاست کے بین الاقوامی تعلقات کی نوعیت کیا ہے؟ غیر مسلموں سے عدم تعلق کی ہدایات کا صحیح پس منظر کیا ہے؟ یہ چند ایسے اہم مسائل ہیں جن کا جدید ذہن اطمینان بخش جواب چاہتا ہے۔

کتاب میں اس نوع کے تمام مباحث پر قرآن وحدیث کی روشنی میں اور مستند مفسرین، محدثین اور فقہاء کے حوالوں کے ساتھ عالمانہ اظہار خیال کیا گیا ہے۔ ہندوستان کے پس منظر میں اس کی خصوصی اہمیت ہے اور دعوت وتبلیغ کے میدان میں کام کرنے والوں کی بھی یہ ایک اہم ضرورت ہے۔

مصنف کی نظر ثانی کے بعد جدید ایڈیشن، آفسیٹ کی حسین طباعت، عمدہ کاغذ، خوب صورت جلد، صفحات: ۳۲۰، قیمت: ۱۸۵/- روپے

تحقیق و تنقید

شبلی کی سیرت نگاری کا تنقیدی جائزہ

پروفیسر محمد انس حسان

مولانا شبلی نعمانی مئی ۱۸۵۷ء میں شہر اعظم گڑھ کے نواحی گاؤں بندول کے ایک متمول گھرانے میں پیدا ہوئے۔ نعمانی کی نسبت امام ابو حنیفہ نعمان بن ثابتؒ کی جانب ہے۔ والد ماجد کا نام شیخ حبیب اللہ تھا، جو اعظم گڑھ کے کامیاب وکیل تھے۔ شبلی کی تعلیم چھ برس کی عمر میں شروع ہوئی اور اگرچہ ایک لحاظ سے اخذِ علوم کا سلسلہ تمام عمر جاری رہا، لیکن ۱۸۷۶ء میں، جب وہ حج کی غرض سے روانہ ہوئے، ان کی رسمی تعلیم کا خاتمہ ہو گیا۔ [۱]

شبلی نے اپنے دور کے مایہ ناز علماء سے معقولات و منقولات کا علم حاصل کیا۔ ان کے اساتذہ میں مولانا محمد فاروق چریا کوٹی، مولانا ارشاد حسین مجددی خیر آبادی، مولانا فیض الحسن سہارن پوری جیسے جید علماء شامل ہیں۔ شبلی میں شروع سے شاعرانہ اور ادیبانہ ذوق تھا۔ ان کی اس فطری صلاحیت کو ان کے استاد مولانا محمد فاروق چریا کوٹی نے جلا بخشی۔ بعد ازاں انھوں نے وکالت کا امتحان پاس کیا اور کچھ عرصہ وکالت بھی کی، تاہم زیادہ عرصہ یہ شغل جاری نہ رہ سکا۔ ۱۸۸۳ء میں وہ علی گڑھ کالج میں تدریسی خدمات انجام دینے لگے۔ سر سید احمد خان ان کے کمالاتِ علمیہ کے معترف اور شبلی بھی ان کے انتہائی معتقد تھے۔ سر سید کی وفات کے بعد ۱۸۹۸ء میں انھوں نے کالج سے استعفیٰ دے دیا۔ اس کے بعد کافی عرصہ ان کا تعلق ندوۃ العلماء لکھنو سے رہا۔ یہاں انھوں نے اہلِ علم کی ایک جماعت پیدا کی، جس نے تحقیق و تصنیف میں اپنا نمایاں کردار ادا کیا۔ اس تمام عرصہ میں انھوں نے

تصنیفی سلسلہ بھی جاری رکھا اور دو درجن کے قریب انتہائی محققانہ اور عالمانہ کتب تصنیف کیں۔ ان کی سب سے آخری اور اہم تصنیف 'سیرۃ النبی' زیرِ تالیف تھی ، کچھ اجزاء تیار ہو چکے تھے، کچھ باقی تھے کہ پندرہ روز کی علالت کے بعد ۱۸ نومبر ۱۹۱۴ء مطابق ۲۸ / ذی الحجہ ۱۳۳۲ھ کو صبح کے وقت وفات پائی۔ ۲؎

نبی کریم ﷺ کی ذات بابرکات سے شبلی کو شعوری اور فطری محبت تھی۔ علی گڑھ میں قیام کے دوران 'بدء الاسلام' کے نام سے ایک مختصر رسالہ لکھا، جو سیرت نگاری میں ان کی پہلی کوشش تھی۔ یہ سلسلہ جاری رہا اور قیامِ حیدر آباد کے دوران انہوں نے سیرت نبوی پر باقاعدہ کتاب لکھنی شروع کی، مگر اس کو پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچا پائے۔ ان کے اس غیر مطبوعہ مسودۂ سیرت سے متعلق شیخ عطاء اللہ لکھتے ہیں:

> ''دورانِ قیام حیدر آباد میں مولانا نے سیرۃ لکھنا شروع کی اور تین ہجری تک کے واقعات قلم بند بھی کر لیے، لیکن اس کا تذکرہ کبھی کسی سے نہیں کیا۔ اربابِ نظر کا کہنا ہے کہ یہ مسودہ، جواب بھی دار المصنفین میں موجود ہے، مولانا کے معیار پر پورا نہیں اترا اور ادھورا چھوڑ دیا گیا''۔ ۳؎

مولانا شبلی کے اس غیر مطبوعہ مسودہ کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے، تاکہ سیرت نبوی سے ان کے ابتدائی رجحانات کا پتہ چل سکے۔ بہر حال سیرت پر ان کے قلم اٹھانے کا باعث یہ ہوا کہ ۱۹۰۵ء میں آکسفورڈ کے پروفیسر مارگولیتھ (۱۸۵۸ء ۔ ۱۹۴۰ء) نے محمد ﷺ کے زیر عنوان ایک کتاب لکھی، جس میں نبی کریم ﷺ کی شخصیت کو مسخ کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ اس کتاب نے شبلی کو بے چین کر دیا، جس طرح سر سید احمد خان (۱۸۱۷ء ۔ ۱۸۹۸ء) کو ولیم میور (۱۸۱۹ئ ۔ ۱۹۰۵ء) کی کتاب 'دی لائف آف محمد' نے بے چین کر دیا تھا۔ ۱۹۰۶ء میں شبلی، مولانا محمد علی جوہر (۱۸۷۸ئ ۔ ۱۹۳۱ئ) کی دعوت پر بڑودہ پہنچے تو انہوں نے شبلی کو اس کتاب کا جواب دینے پر ابھارا۔ شبلی خود یہ چاہتے تھے کہ مستشرقین کی فریب کاریوں اور غلط

بیانیوں کا جواب دیں، لیکن اس خواہش کی تکمیل کے لیے انہیں مزید چھ (۶) سال کا عرصہ لگ گیا۔ چنانچہ انہوں نے ۱۹۱۲ء میں سیرتِ نبوی پر ایک محققانہ کتاب لکھنے کا اعلان کر دیا۔ وہ اس بات سے بھی بہ خوبی آگاہ تھے کہ اس کام کے لیے کثیر وسائل درکار ہوں گے۔ چنانچہ انہوں نے قوم سے اپیل کی کہ ان کی پچاس ہزار روپے یک مشت اور دوسو روپے ماہوار کی مالی معاونت کی جائے۔ اس اعلان پر قوم نے لبیک کہا اور ان کی مطلوب مالی اعانت کے علاوہ کتب قدیمہ وجدیدہ کے ذریعہ ان کی مدد بھی کی۔ ڈاکٹر انور محمود خالد لکھتے ہیں:

''عطیہ کا اعلان شائع ہوتے ہی مسلمانوں نے انفرادی طور پر چندے بھیجنا شروع کیے، لیکن منشی محمد امین زبیری کی ترغیب پر نواب سلطان جہاں بیگم والی بھوپال نے دو برس کے لیے دوسو روپیہ ماہوار دینے پر آمادگی ظاہر کی اور ان کے بیٹے نواب زادہ حمید اللہ خان نے کتابوں کی خریداری کے لیے دوہزار روپے الگ دیے۔ دوسال کا ابتدائی وظیفہ ختم ہونے کے بعد وظیفہ تا تکمیل سیرت نبوی بڑھا دیا گیا''۔ ۴؎

مولانا کو مصارف کی طرف سے اطمینان نصیب ہوا اور انہوں نے لکھا:

مصارف کی طرف سے مطمئن ہوں میں بہرصورت
کہ ابر فیض سلطان جہاں بیگم زرافشاں ہے
رہی تالیف و تنقید روایت ہائے تاریخی
تو اس کے واسطے حاضر مرا دل ہے مری جان ہے

مسایلِ وسائل پر قابو پانے کے بعد مولانا نے کام شروع کیا۔ ۱۶/جون ۱۹۱۲ء کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے ۱۳ جون ۱۹۱۲ء سے باقاعدہ کام شروع کر دیا تھا۔ ان کے خطوط سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ۳۱/مارچ ۱۹۱۳ء تک مسودہ 'فتح مکہ' اور 'غزوہ حنین' تک پہنچ چکا تھا۔ اکتوبر ۱۹۱۳ء میں پہلی جلد کا مسودہ تیار ہو گیا تو اس کی نظر ثانی مولانا عبید اللہ سندھی (۱۸۱۲ئ۔ ۱۹۴۴ئ) نے کی۔ ۵؎

مولانا شبلی نے کام کے آغاز سے پہلے اپنے معاونین کی ایک جماعت تیار

کی، جن سے عربی، انگریزی اور دیگر یورپی زبانوں میں لکھی جانے والی کتبِ سیرت کے منتخب عنوانات کے تراجم اور خلاصے تیار کروائے گئے۔ ان معاونین میں کون لوگ شامل تھے؟ اس حوالہ سے ڈاکٹر انور محمود خالد لکھتے ہیں:

> ''جن لوگوں نے اس کام میں وقتاً فوقتاً مولانا شبلی کی معاونت کی، ان میں سید سلیمان ندوی، عبدالماجد دریا بادی اور عبدالسلام ندوی نے تو باقاعدہ اسٹاف کی حیثیت سے کام کیا، لیکن ان کے علاوہ مولانا شیروانی، شیخ عبدالقادر، مہدی افادی، جنید (اپنے بھائی)، سید نواب علی اور مولانا حمید الدین فراہی سے خط و کتابت کے ذریعے مدد لیتے رہے''۔[۶]

سیرت النبی کی پہلی جلد مکمل ہوجانے کے بعد مولانا کو اس کی طباعت کی فکر لاحق ہوئی۔ اس سلسلے میں مولانا ابوالکلام آزاد (۱۸۸۸ئ۔۱۹۵۸ئ) اور سید سلیمان ندوی (۱۸۸۴ئ۔۱۹۵۳ئ) سے مشورہ کیا تو دونوں نے ٹائپ میں چھاپنے کا مشورہ دیا۔ چنانچہ مولانا آزاد کے 'الہلال' میں مقدمہ کے ابتدائی چار صفحات شائع ہوئے تو مخالفین نے آسمان سر پر اٹھالیا۔ شیخ عطاء اللہ لکھتے ہیں:

> ''نمونہ الہلال میں چھپا تو مخالفین نے آسمان سر پر اٹھالیا۔ بیگم بھوپال کے پاس شکایتیں پہنچیں''۔[۷]

تاہم مولانا نے ہمت نہیں ہاری اور کام کو مسلسل جاری رکھا۔ اکتوبر ۱۹۱۴ء میں وہ اپنے بھائی کے انتقال پر اعظم گڑھ لوٹ آئے۔ ان کو بھائی کے انتقال کا بڑا صدمہ تھا۔ ان کی اپنی صحت بھی اب بالکل جواب دے رہی تھی اور سیرت النبی کا کام مکمل ہوتا نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ مولانا حمیدالدین فراہی (۱۸۶۳ئ۔ ۱۹۳۰ئ) کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

> ''سیرت پوری نہ ہوسکی اور کوئی نظر نہیں آتا کہ اس کام کو پورا کرسکے''۔[۸]

مولانا کو اپنی علالت اور مرضِ وفات میں بھی سیرت کی تکمیل کی فکر تھی۔

چنانچہ انتقال سے کچھ روز قبل سیرت کے مسودے اور اس کے متعلقات کو ایک الماری میں رکھوا دیا تھا اور تاکید کی تھی کہ:

"یہ مسودے حمید الدین (فراہی) اور سید سلیمان (ندوی) کے سپرد کیے جائیں۔ان دو کے سوا کسی اور کو ہرگز نہ دیے جائیں"۔۹؎

جب حالت نازک ہوگئی تو انہوں نے ۱۰ر نومبر ۱۹۱۴ء کو مولانا ابو الکلام آزاد، مولانا حمید الدین فراہی اور مولانا سید سلیمان ندوی کو فرداً فرداً تار بھجوائے کہ ان سے آ کر مل لیں۔سید سلیمان ندوی تار پہنچنے سے پہلے ہی بہ غرضِ عیادت تشریف لائے تو یہ سعادت ان کے حصے میں آئی کہ وہ سیرت کی تکمیل کر کے اپنے استاد کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کریں۔اس آخری ملاقات کی روداد سید سلیمان ندوی ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

"میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر فرمایا: سیرت میری تمام عمر کی کمائی ہے۔سب کام چھوڑ کر سیرت تیار کرو۔ میں نے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا: "ضرور ضرور"۔۔۔زبان مبارک سے تین مرتبہ سیرت، سیرت، سیرت کہا اور پھر انگلی سے لکھنے کا اشارہ کر کے کہا: سب کام چھوڑ کے"۔۱۰؎

سیرت النبی کی پہلی جلد مولانا کے انتقال کے چار (۴) سال بعد یعنی ۱۹۱۸ء میں شائع ہوئی۔اس کے بعد اس کے باقی اجزاء کی تکمیل مولانا سید سلیمان ندوی نے کی۔چنانچہ دوسری جلد ۱۹۲۰ء تیسری جلد ۱۹۲۴ئ، چوتھی جلد ۱۹۳۲ء، پانچویں جلد ۱۹۳۵ء، چھٹی جلد ۱۹۳۸ء اور ساتویں جلد بیالیس (۴۲) سال کے طویل وقفے کے بعد ۱۹۸۰ء میں شائع ہوئی۔

شبلی کی سیرت نگاری کی خصوصیات و امتیازات

شبلی اور ان کی کتاب ’سیرۃ النبی‘ کے اس مختصر تعارف کے بعد اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کی سیرت نگاری کی خصوصیات و امتیازات پر روشنی ڈالی جائے۔

(ا) سیرت نگاری کے اصول

شبلی کی سیرۃ النبی کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے سیرت نگاری کے اصول متعین کیے ہیں اور فنِ سیرت نگاری کو نئے سرے سے ترتیب دیا ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے کتاب کے آغاز میں ایک انتہائی جامع اور محققانہ مقدمہ لکھا، جس میں سیرت کے مواد کے روایتی و درایتی معیار پر بڑی شان دار بحث کی ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں: ''سیرۃ النبی کا مقدمہ عالمانہ تنقید کا شاہ کار ہے''۔ ۱۱؎
مزید لکھتے ہیں:

> ''اس میں واقعات کی تعیین سیرت کی تمام قدیم ادبیات کی چھان بین کے بعد درایت کے جدید اصولوں کے مطابق ہوئی ہے۔ مصنف نے قدیم اور جدید دونوں سے استفادہ کیا ہے''۔ ۱۲؎

مولانا شبلی نے سیرت کی تالیف کے ضمن میں جن اصولوں کو مدنظر رکھا ہے ان میں سے چند اہم اصول درج ذیل ہیں۔

(الف) قرآن کریم سے استدلال

سیرۃ النبی میں قرآن کریم سے خوب استفادہ کیا گیا ہے اور سیرت کے ضمن میں قرآنی آیات سے جا بہ جا استدلال کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں مولانا شبلی خود لکھتے ہیں:

> ''(میں نے) سیرت کے واقعات کے متعلق جو کچھ قرآن مجید میں مذکور ہے، اس کو سب پر مقدم رکھا ہے''۔ ۱۳؎

(ب) احادیثِ صحیحہ سے استناد

سیرت النبی کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اس میں محدثانہ اسلوب کی جھلک واضح طور پر نظر آتی ہے۔ چوں کہ سیرت نگاری میں احادیثِ مبارکہ کا بڑا اہم کردار ہے، اس لیے مولانا نے ان سے بھی استفادہ کیا ہے۔ وہ اپنے پیش رو سیرت نگاروں کے برخلاف احادیثِ صحیحہ کو روایاتِ سیرت پر ترجیح دیتے ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

''قرآنِ مجید کے بعد حدیث کا درجہ ہے اور احادیثِ صحیحہ کے سامنے سیرت کی روایتیں نظر انداز کر دی ہیں۔ جو واقعات بخاری و مسلم میں مذکور ہیں ان کے مقابلے میں سیرت یا تاریخ کی کوئی ضرورت نہیں''۔۱۴۔

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

''سیرت کی روایتیں بہ اعتبار پایۂ صحت احادیث کی روایتوں سے فروتر ہیں۔ اس لیے بہ صورتِ اختلاف احادیث کی روایات کو ہمیشہ ترجیح دی جائے گی''۔ ۱۵۔

(ج) راویانِ سیرت کا معیار

راویان سیرت کے معاملے میں مولانا نے خوب تحقیق و تنقید سے کام لیا ہے۔ ان کے نزدیک اگر احادیث میں اختلاف ہوتو راویانِ عقل و ہوش کی روایات کو ترجیح حاصل ہوگی۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

''بہ صورتِ اختلافِ روایات احادیث، رواۃِ ارباب فقہ و ہوش کی روایات کو دوسروں پر ترجیح ہوگی''۔۱۶۔

مولانا شبلی نے سیرت النبی کے مقدمہ میں راویانِ سیرت کا ایک نقشہ مرتب کیا ہے، جس میں متعدد کتب اسماء الرجال سے استفادہ کرتے ہوئے ان کے مختصر حالات اور روایت میں ان کے درجہ پر روشنی ڈالی ہے۔ انھوں نے واقدی پر کڑی تنقید کی ہے۔ راقم کے نزدیک اردو سیرت نگاروں میں واقدی پر اس قدر سخت تنقید شاید کسی اور نے نہیں کی۔

(د) روایات کی عقلی و درایتی جانچ

مولانا شبلی علم معقولات کے زبردست عالم تھے۔ ان کے اس ذوق کی چھاپ 'سیرۃ النبی' پر بھی واضح طور سے محسوس کی جاسکتی ہے۔ ان کے نزدیک واقعاتِ سیرت

کو عقلی و درایتی معیار پر پرکھنے کی ضرورت ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

"کتب سیرت محتاجِ تنقیح ہیں اور ان کی روایات و اسناد کی تنقید لازم ہے"۔ ۱۷؎

مزید لکھتے ہیں:

"جو روایت عام وجوہِ عقلی، مشاہدۂ عام، اصولِ مسلّمہ اور قرائن حال کے خلاف ہوگی، لائق حجت نہ ہوگی"۔ ۱۸؎

تاہم موضوع کی اہمیت کے اعتبار سے وہ اخبار آحاد کو بھی قبول کر لیتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

"روایاتِ آحاد کو موضوع کی اہمیت اور قراینِ حال کی مطابقت کے لحاظ سے قبول کرنا چاہیے"۔ ۱۹؎

(ہ) واقعات کے اسباب وعلل کا ذکر

شبلی اسباب وعلل کی تلاش کے قائل ہیں، تاہم وہ یورپ کے طریقِ اسباب و علل کی دور از کار بحثوں کو غیر معتدل اور خود غرضی پر محمول کرتے ہیں۔ اس تعلق سے وہ لکھتے ہیں:

"یورپین مورخ ہر واقعہ کی علت تلاش کرتا ہے اور انتہائی دور دراز قیاسات اور احتمالات سے سلسلۂ معلومات پیدا کرتا ہے۔ اس میں بہت کچھ اس کی خود غرضی اور خاص مطمح نظر کو دخل ہوتا ہے ـ ـ ـ ـ ـ بہ خلاف اس کے اسلامی مؤرخ نہایت سچائی اور خالص بے طرف داری سے واقعات کو ڈھونڈتا ہے۔ اس کو اس سے کچھ غرض نہیں ہوتی کہ واقعات کا اثر اس کے مذہب پر، معتقدات پر اور تاریخ پر کیا پڑے گا"۔ ۲۰؎

(۲) عمدہ اسلوبِ بیان

شبلی کا اسلوب پختہ اور عالمانہ ہونے کے باوجود سادہ اور دل کش ہے۔

اس میں قوت ، جوش ،خود اعتمادی ، برتری ، صلابت ،متانت ،ایجاز و اختصار ،چستی ، برجستگی ، بے ساختگی اور شعریت پائی جاتی ہے۔ ۲۱۔ چوں کہ یہ ان کی آخری کتاب ہے اس لیے یہ ان کے کمالاتِ علمیہ کی جامع اور ادبی صفات سے مالا مال ہے۔ اسلوبِ بیان کے حوالہ سے ڈاکٹر انور محمود خالد نے لکھا ہے:

> ''ان کا اسلوبِ بیان اتنا دل کش ہے کہ تاریخ وسیر جیسے ٹھوس موضوعات کو بھی ادبی چاشنی سے لذت انگیز بنا دیتا ہے ۔ الفاظ کی موزونیت ،تراکیب اور جملوں کی موسیقیت نے شبلی کے اسلوبِ بیان میں جمالیاتی اقدار پیدا کیں اور سیرت کے مقدس موضوع نے اس میں رفعت وعظمت کا اضافہ کیا''۔ ۲۲۔

شبلی کے اسلوب کی چند خصوصیات درج ذیل ہیں:

(الف) ایجاز واختصار

مولانا نے اسلوبِ بیان کو مؤثر بنانے کے لیے ایجاز و اختصار سے کام لیا ہے۔بعض اوقات ان کے اسلوب میں اطناب کا گمان گزرتا ہے،لیکن اگر غور کیا جائے تو اس میں بھی ایجاز و اختصار کا پہلو نظر آئے گا۔ مثال کے طور پر ان کی یہ عبارت ملاحظہ فرمائیں:

> ''کارکنانِ قضا و قدر کی بزم آرائیاں ، عناصر کی جدّت طرازیاں ، ماہ و خورشید کی فروغ انگیزیاں ، ابر وباد کی تر دستیاں ، عالمِ قدس کے انفاسِ پاک،توحیدِ ابراہیم ، جمالِ یوسف ، معجز طرازی موسیٰ ، جان نوازی مسیح سب اس لیے تھے کہ یہ متاع ہائے گراں شاہنشاہِ کونین ﷺ کے دربار میں کام آیے''۔ ۲۳۔

اس عبارت میں مولانا کا ایجاز و اختصار اپنے عروج پر ہے، جس نے اسلوبِ بیان کو انتہائی عمدہ بنا دیا ہے ۔ یہی بات اگر مولانا ابوالکلام آزاد جیسے اطناب پسند ادیب کو بیان کرنی ہوتی تو کئی صفحات درکار ہوتے ۔

(ب) استعارات ومجازات

مولانا شبلی اپنی نثر کو عمدہ بنانے کے لیے تشبیہات کے بجائے استعارات و مجازات سے زیادہ کام لیتے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ عبارت ملاحظہ ہو:

''تیروں کا مینہ برس رہا تھا، بارہ ہزار فوجیں ہوا ہوگئی تھیں، لیکن ایک پیکر مقدس پابہ رجا تھا، جو تنہا ایک فوج، ایک ملک، ایک اقلیم، ایک عالم، بلکہ مجموعۂ کائنات تھا''۔ ۲۴؎

(ج) غیر ضروری جزئیات سے اجتناب

مولانا کی نثر کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ غیر ضروری جزئیات حذف کر دیتے ہیں، لیکن اس خوبی سے کہ مقدرات ومحذوفات کی جانب اشارے برقرار رہتے ہیں۔ صلح حدیبیہ کے موقع پر حضرت علیؓ نے نبی کریم ﷺ کے کہنے کے باوجود 'محمد رسول اللہ' میں سے 'رسول اللہ' کو نہیں مٹایا۔ اس پر شارحینِ حدیث نے بحث کی ہے کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ کا کہنا کیوں نہیں مانا؟ اس مسئلہ کو شبلی نے صرف دو جملوں میں حل کر دیا ہے:

''حضرت علیؓ سے زیادہ کون فرماں گزار ہوسکتا تھا؟ لیکن عالمِ محبت میں ایسے مقامات بھی آتے ہیں، جہاں فرماں بری سے انکار کرنا پڑتا ہے''۔ ۲۵؎

(د) منطقیت واستدلال

مولانا کی نثر میں منطقیت اور استدلال کا وصف بھی پایا جاتا ہے۔ اسلوب ایسا عمدہ ہے کہ عقل فوراً تسلیم کر لیتی ہے۔ مثال کے طور پر یہ عبارت ملاحظہ فرمائیں:

''اگرچہ بارگاہ الٰہی سے فتح ونصرت کا وعدہ ہوچکا تھا۔ عناصرِ عالم آمادۂ مدد تھے۔ ملائکہ کی فوجیں ہم رکاب تھیں۔ تاہم عالمِ اسباب کے لحاظ سے آپ نے اصولِ جنگ کے مطابق فوجیں مرتب کیں''۔ ۲۶؎

(۵) طنزِ ملیح کا استعمال

اسلوبِ بیان میں طنزیہ بیان بھی بعض اوقات قوت و تاثیر پیدا کر دیتا ہے۔ شبلی کے ہاں ہمیں یہ اسلوب بھی ملتا ہے۔ مثال کے طور پر ہجرتِ مدینہ کی رات جب کفار نے آپ ﷺ کے گھر کا محاصرہ کرلیا تو شبلی لکھتے ہیں:

> ''اہلِ عرب زنانہ مکان کے اندر گھسنا معیوب سمجھتے تھے، اس لیے باہر ٹھہرے رہے کہ آں حضرت ﷺ نکلیں تو یہ فرض ادا کیا جائے''۔ ۲۷۔

(۳) مؤرخانہ شعور و آگہی

مولانا شبلی کے مؤرخانہ شعور و آگہی کے حوالہ سے ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی لکھتے ہیں:

> ''مولانا شبلی چوں کہ نہایت پختہ اور رچا ہوا تاریخی شعور رکھتے تھے اور تاریخ نگاری کے جدید اصول و آداب سے بھی پوری طرح واقف تھے، اس لیے انھوں نے تصنیفِ سیرت کے دوران اس ذوق سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور سیرۃ النبی کو سیرت کی قدیم کتابوں کے انداز میں لکھنے کے بجائے تاریخ نگاری کے نئے اصولوں کے مطابق تصنیف کیا''۔ ۲۸۔

مؤرخانہ شعور سے فائدہ اٹھاتے ہوئے شبلی نے سیرت کے عام واقعات سے بڑے گہرے اور اہم نتائج نکالے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے اسباب و علل کی تلاش میں مؤرخانہ دیانت داری اور غیر جانب داری کو برقرار رکھا ہے۔ 'قریش کی مخالفت اور اس کے اسباب'، 'غزوۂ بدر'، 'غزوات پر دوبارہ نظر' جیسے عناوین کے تحت مولانا نے جو کچھ لکھا ہے اس سے ان کی دقیق نظری اور تاریخی فہم کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

(۴) منفرد اسلوبِ تحریر

مولانا شبلی کی تحریر میں سلیقۂ ربط و ترتیب نے ایک خاص حسن پیدا کر دیا

ہے۔ ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی لکھتے ہیں:

"مولانا شبلی کو قدرت نے تحریر و تصنیف کا ایک خاص سلیقہ ودیعت فرمایا تھا اور وہ اس خاص وصف میں اپنے تمام معاصرین کے درمیان ممتاز تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تمام تصانیف میں عموماً اور سیرت النبی میں خصوصاً بے ربطی، انتشار اور بے ترتیبی کا شائبہ بھی نہیں گزرتا۔ سیرۃ النبی کا موازنہ اردو کی کسی بھی دوسری کتابِ سیرت سے کیا جائے تو مولانا کے سلیقۂ تحریر و تصنیف کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہوا نظر آئے گا"۔ ۲۹ے

اس اندازِ تحریر کو سیرۃ النبی کی پہلی جلد میں 'مواخاۃ' کے ذیل میں بہ خوبی ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔

(۵) جامعیت وعلمیت

شبلی کی سیرت نگاری میں جامعیت وعلمیت کا وصف بخوبی دیکھا جاسکتا ہے۔ ان کے نقادوں نے بھی سیرۃ النبی کی جامعیت کا اعتراف کیا ہے۔ ڈاکٹر انور محمود خالد لکھتے ہیں:

"بیش تر نقادوں نے 'سیرۃ النبی' کو اپنے موضوع پر سب سے زیادہ مکمل اور جامع تصنیف قرار دیا ہے، بلکہ بعض نے تو یہ بھی کہا ہے کہ اس کا جواب دنیا کی کسی زبان میں نہیں ہے"۔ ۳۰ے

سیرت النبی کی جامعیت پر ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں:

"جامعیت اس کا وصف خاص ہے، جس میں اب تک کوئی اس کا مثیل نہیں ملتا"۔ ۳۱ے

اگرچہ ڈاکٹر سید علی شاہ 'سیرۃ النبی' کے اس وصف کو تسلیم نہیں کرتے ۳۲ے تاہم ڈاکٹر انور محمود خالد نے ان کے اعتراضات کا محاکمہ کرتے ہوئے ان تمام شکوک و شبہات کو دور کر دیا ہے جو سیرت کی جامعیت کے حوالے سے اٹھائے گئے ہیں۔

(۶) حکمت اور مصالح کا ذکر

شبلی کی سیرت نگاری کا ایک خاص وصف یہ بھی ہے کہ وہ سیرت کے ذیلی واقعات سے حِکَم و مصالح کا استخراج کرتے ہیں ۔ چنانچہ 'مواخاۃ' 'غزوات' اور 'تحویل قبلہ' کے ذیل میں انہوں نے انتہائی عمدہ نکات بیان کیے ہیں۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی لکھتے ہیں :

> ''سیرۃ النبی کی انفرادیت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ مولانا شبلی نے شاہ ولی اللہ دہلوی صاحب حجۃ اللہ البالغۃ کے انداز پر اسلامی تاریخ اور سیرت کے بعض واقعات کی حکمتیں اور مصلحتیں بھی بیان کی ہیں۔ سیرت کی قدیم کتابیں ان عنوانات اور مباحث سے خالی تھی''۔ ۳۳ ؎

(۷) مستشرقین کا محاکمہ

شبلی نے 'سیرۃ النبی' کی تالیف کا بنیادی مقصد ہی مستشرقین کے باطل افکار کا رد قرار دیا ہے۔ اگر چہ ان سے قبل مولانا محمد قاسم نانوتوی (۱۸۳۲ئ۔ ۱۸۸۰ء)، مولانا رحمت اللہ کیرانوی (۱۸۱۸ء ۔۱۸۹۱ء) اور سرسید احمد خان (۱۸۱۷ء ۔ ۱۸۹۸ئ) نے نبی کریم ﷺ کی ذات پر مستشرقین کے اعتراضات اور ان کے باطل افکار کا رد کرنے میں اپنا نمایاں کردار ادا کیا تھا، مگر شبلی کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ وہ قدیم و جدید کا امتزاج تھے۔ ان کی یہ خصوصیت سیرت النبی میں بھی نظر آتی ہے۔ ایک طرف ان کے دلائل عالمانہ طرزِ اسلوب لیے ہوئے ہوتے ہیں تو دوسری طرف وہ عقل و درایت کا دامن بھی ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔

چوں کہ مستشرقین نے باقاعدہ ایک منظم سازش کے تحت سیرت نبوی پر اعتراضات کا سلسلہ شروع کر رکھا تھا اس لیے مولانا کے دردمند دل نے محسوس کیا کہ ان کے اعتراضات کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں :

> ''یہ واقعات تھے جنہوں نے مجھ کو بالآخر مجبور کیا اور میں نے سیرتِ

نبوی پر ایک مبسوط کتاب لکھنے کا ارادہ کرلیا''۔ ۳۴؎

مولانا کی خواہش تھی کہ مستشرقین کے اعتراضات پر سیرت کی ایک مکمل جلد ہو، مگر ان کی زندگی نے وفا نہ کی۔ بعد میں مولانا سید سلیمان ندوی نے بھی شاید اس کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ اس کے باوجود مستشرقین کے اعتراضات سے متعلق مولانا کی تحریر کردہ سیرت میں کافی کچھ مواد آ گیا ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے لکھا ہے:

''اس (سیرۃ النبی) میں مغربی سوانح نگاروں کے پھیلائے ہوئے وساوس اور مغالطوں پر نقد و جرح کرکے ان کے نام نہاد عقلی طریق کار کے پرخچے اڑائے گئے ہیں''۔ ۳۵؎

(الف) مستشرقین کے مآخذ اور اقسام

شبلی نے مستشرقین کی سینتیس (۳۷) کتب کی نشان دہی کی ہے، جو تالیف کے دوران ان کے پیشِ نظر رہیں۔

مستشرقین کو انھوں نے تین حصوں میں تقسیم کیا ہے:

(۱) وہ مستشرقین جو عربی زبان اور اصل مآخذ سے واقف نہیں۔ ان لوگوں کا سرمایۂ معلومات اوروں کی تصنیفات اور تراجم ہیں۔

(۲) وہ مستشرقین جو عربی زبان اور علم و ادب اور تاریخ وفلسفۂ اسلام کے بہت بڑے ماہر ہیں، لیکن مذہبی لٹریچر اور سیرت کے فن سے نا آشنا ہیں۔

(۳) وہ مستشرقین جنہوں نے خاص اسلامی اور مذہبی لٹریچر کا کافی مطالعہ کیا ہے، لیکن باوجود عربی دانی، کثرت مطالعہ، تفحّصِ کتب کے ان کا یہ حال ہے کہ

دیکھتا سب کچھ ہوں لیکن سوجھتا کچھ بھی نہیں۔ ۳۶؎

(ب) مستشرقین کے اعتراضات

دورانِ تالیفِ سیرت مولانا کے پیش نظر مستشرقین کے درج ذیل

اعتراضات تھے:

(۱) آں حضرت ﷺ کی مکی زندگی پیغمبرانہ اور مدنی زندگی بادشاہانہ تھی۔

(۲) کثرت ازواج اور میل الی النسائ۔

(۳) مذہب کی اشاعت جبرا ورزور سے۔

(۴) لونڈی غلام بنانے کی اجازت اوراس پرعمل۔

(۵) دنیاداروں کی سی حکمتِ عملی اور بہانہ جوئی۔ ۳۷۔

(ج) مستشرقین کے اعتراضات کی وجوہ

مستشرقین کے ان اعتراضات کی بڑی وجہ تو ان کا مذہبی اور سیاسی تعصب ہے،تاہم مولانا نے اس کے علاوہ بھی چند وجوہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔مثلاً سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ان کا تمام تر سرمایۂ استناد صرف سیرت و تاریخ کی کتابیں ہیں۔دوسری بڑی وجہ یہ ہے کہ یورپ کے اصولِ تنقیح شہادت اورہمارے اصولِ تنقیح میں سخت اختلاف ہے۔ ۳۸۔

شبلی نے اپنی کتابِ سیرت میں مستشرقین کے ان اعتراضات کا محاکمہ کیا ہے۔ ڈاکٹرظفراحمد صدیقی لکھتے ہیں:

> ''سیرۃ النبی کو دوسری کتبِ سیرت کے درمیان اس پہلو سے بھی امتیاز حاصل ہے کہ اس میں سیرت نبوی کے متعلق مستشرقینِ یورپ کے اعتراضات و اشکالات کے جواب دیے گئے اور نوجوان ذہنوں کی تسکین وتشفی کے سامان خاص طور پر بہم پہنچائے گئے ہیں''۔۳۹۔

(۸) عالمانہ طرزِتخاطب

شبلی کی سیرت نگاری کی ایک خصوصیت ان کا عالمانہ طرزِتخاطب بھی ہے۔ اس حوالہ سے ڈاکٹرظفراحمد صدیقی لکھتے ہیں:

''سیرۃ النبی کی ایک خصوصیت ، جو اس کتاب کے قاری کو متاثر کرتی ہے، وہ عالمانہ طرزِ تخاطب ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ مولانا شبلی نے اس کتاب کو شروع سے آخر تک حوالوں سے مزین رکھا ہے۔ قرآن پاک کے علاوہ تفسیر ، حدیث ، اصولِ حدیث، اسماء الرجال، تاریخ ، سیرت اور مغازی کی اہم اور مشہور کتابوں کے حوالے اس کتاب میں جابجا ملیں گے''۔[۴۰]

شبلی کی سیرت نگاری کے نقائص اور خامیاں

شبلی کی سیرت نگاری کی ان خصوصیات کے ساتھ اس میں بعض ایسے نقائص اور خامیاں بھی پائی جاتی ہیں جن پر ان کے ناقدین نے خوب نقد کیا ہے۔ ذیل میں ان پر روشنی ڈالی جاتی ہے:

(۱) اپنے اصولوں سے بے اعتنائی

شبلی نے 'سیرت النبی' کے مقدمے میں سیرت نگاری کے جن اصولوں پر کتاب لکھنے کا اظہار کیا تھا، وہ خود ان اصولوں پر عمل نہیں کر پائے۔ انھوں نے دیگر سیرت نگاروں کے برعکس سیرت نگاری میں محدثانہ طرزِ اسلوب کی پیروی کرنے پر زور دیا ہے اور صحیح حدیث نہ ملنے کی صورت میں روایاتِ سیرت سے استفادہ کا اصول وضع کیا ہے۔ اگرچہ انھوں نے متعدد مقامات پر اس اصول پر عمل کرتے ہوئے احادیثِ صحیحہ کو روایاتِ سیرت پر ترجیح دی ہے، لیکن متعدد مقامات ایسے بھی ہیں جہاں اس اصول سے صرفِ نظر کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر 'ایمان ابوطالب'، 'غزوۂ بنی المصطلق'، حضرت جویریہؓ کا واقعہ، ریحانہؓ کا واقعہ، قتل کعب بن اشرف، سعد بن معاذؓ کا واقعہ، پیداوارِ خیبر کی تقسیم، قتل کنانہ بن ابی الحقیق، غزوۂ موتہ، غزوۂ حنین، وغیرہ مقامات پر انہوں نے احادیثِ صحیحہ کو نظر انداز کرتے ہوئے روایاتِ سیرت پر اعتماد کیا ہے۔ انھوں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ بعض اوقات روایاتِ صحیحہ پر شدید

تنقید بھی کی ہے۔ ۴۲

راویانِ سیرت کے حوالے سے مولانا نے جو کڑے اصول متعین کیے ہیں ان کا وہ خود التزام نہیں کر پائے۔ مثال کے طور پر وہ واقدی کی شدید تنقیص کرتے ہیں اور ان کی روایاتِ سیرت کو قطعی اہمیت نہیں دیتے، مگر ان کے شاگرد ابن سعد کی روایات پر نہ صرف اعتماد کرتے ہیں، بلکہ ان کی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''واقدی خود تو قابلِ ذکر نہیں، لیکن ان کے تلامذۂ خاص میں سے ابن سعد نے آں حضرت ﷺ اور صحابہ کے حالات میں ایسی جامع اور مفصل کتاب لکھی کہ آج تک اس کا جواب نہ ہوسکا''۔ ۴۳

شبلی واقدی کو نا قابلِ اعتماد قرار دیتے ہیں اور ان کے شاگرد ابن سعد پر اعتماد کرتے ہیں، لیکن انھوں نے سیرت النبی میں ایک بڑی تعداد ان روایات کی بھی شامل کرلی ہے جو ابن سعد نے براہِ راست واقدی سے لی ہیں۔ مثال کے طور مطعم بن عدی کے جوار کا واقعہ، قریش کی جانب سے رسول ﷺ کی ایذاء رسانیوں کا ذکر، ازدواج مطہرات کے مکانات کی سمت اور نبی کریم ﷺ کے قبائل عرب کے دورے، وغیرہ۔ ۴۴

اس کے علاوہ دیگر کئی راویانِ سیرت، جن پر شبلی نے بداعتمادی ظاہر کی ہے، ان کی روایات سے بھی انھوں نے اکتساب کیا ہے، حتیٰ کہ کئی مجہول رواۃ کی روایات بھی لی ہیں۔

(۲) غیر مستند مآخذ و مصادر

مولانا نے سیرت النبی میں جو روایات ذکر کی ہیں، ان کو بنیادی طور پر تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

(الف) وہ روایات جن کا ماخذ احادیث ہیں۔

(ب) وہ روایات جن کا ماخذ سیرت و تاریخ کی کتب ہیں۔

(ج) وہ روایات جو بغیر حوالے کے نقل کی گئی ہیں۔

ڈاکٹر انور محمود خالد نے سیرۃ النبی کے مآخذ کے حوالے سے لکھا ہے:

''سیرۃ النبی کی تالیف میں جن کتابوں سے مدد لی گئی ہے، اگر ان سب کے حوالے جمع کیے جائیں تو بذات خود ایک چھوٹی سی کتاب بن سکتی ہے۔۔۔۔اگر پوری کتاب کے مآخذ پر نظر ڈالی جائے تو کتبِ حوالہ کا ایک سمندر آنکھوں کے سامنے ٹھاٹھیں مارنے لگتا ہے''۔۴۵؎ لیکن ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی نے ان کے اس قول کی تردید کی ہے۔ انہوں نے ایک گوشوارہ مرتب کیا ہے جس میں 'سیرۃ النبی' کے تمام حوالہ جات کی بڑی جامع تفصیل دی ہے۔ ان کے بقول 'سیرۃ النبی' کے بنیادی مآخذ نو کتابیں ہیں، جن کے حوالے سب سے زیادہ ہیں۔ ان نو کتب میں 'سیرۃ النبی' کے حوالہ جات کا تناسب درج ذیل ہے:

(۱) صحیح بخاری (۲۷۰)(۲) ابوداود (۱۲۵)(۳) طبقات ابن سعد (۱۱۴) (۴) تاریخ طبری (۸۷)(۵) صحیح مسلم (۸۲)(۶) سیرت ابن ہشام (۶۵) (۷) زرقانی (۱۵۸)(۸) مسند احمد بن حنبل (۵۰)(۹) الاصابۃ (۴۲)۔ سیرت النبی میں حدیث کے مجموعی طور پر ۶۱۴ اور کتبِ سیرت و تاریخ کے مجموعی طور پر ۴۲۸ حوالہ جات مذکور ہیں۔ اس تفصیل سے ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے:

> ''اس کتاب میں مذکور وہ روایات و واقعات، جنہیں کسی حوالے کے بغیر داخلِ کتاب کرلیا گیا ہے اور جو بالعموم کتبِ سیرت ہی سے ماخوذ ہیں، اگر ان کے اعداد و شمار کو بھی کتب سیرت و تاریخ کے حوالوں میں شامل کرلیا جائے تو سیرۃ النبی میں مذکور کم مستند یا غیر مستند روایات کا تناسب پچاس فی صد تک پہنچ جائے گا''۔۴۶؎

(۳) تضاد و تناقض

سیرت النبی کے مطالعہ کے دوران متعدد مقامات پر تضاد کا احساس بھی ہوتا ہے۔

(الف) بعض اوقات شبلی اپنی کہی ہوئی بات کے برعکس بات کہہ جاتے ہیں۔اس کی مثال مراسیلِ صحابہ کی حجیت اور عدم حجیت کا مسئلہ ہے۔ ۴۷؎

(ب) بعض اوقات وہ روایاتِ صحیحہ اور روایاتِ سیرت میں جمع وتطبیق کرتے ہیں، مگر اکثر جگہ اس کے بالکل برعکس کرتے ہیں۔ ۴۸؎

(ج) بعض اوقات روایات کا کچھ حصہ ان کے نزدیک معتبر اور کچھ حصہ غیر معتبر ہوتا ہے، مثال کے طور پر عبداللہ بن خطل کے سببِ قتل والی روایت۔ ۴۹؎

(د) خطبات واشعار کے ذیل میں بھی مولانا اسی تضاد کا شکار ہیں۔کہیں ان پر تنقید کرتے ہیں اور کہیں آنکھیں بند کر کے انھیں قبول کر لیتے ہیں۔ مثال کے طور پر ابو طالب سے منسوب 'قصیدہ لامیہ' کو انھوں نے سرتاپا موضوع قرار دیا ہے۔ تاہم سید سلیمان ندوی نے حاشیہ میں اس کے کچھ اشعار کا بخاری ومسلم میں ہونا ثابت کیا ہے۔۵۰؎

(۴) تفرّدات اور جمہور کے مسلک کی مخالفت

سیرۃ النبی میں مولانا شبلی نے بعض مسائل میں جمہور سے ہٹ کر موقف اختیار کیا ہے۔اگر ان کے اختیار کردہ موقف میں طاقت وتوازن ہوتا تو بڑی اچھی بات تھی ،مگر حقیقت یہ ہے کہ ان کے اختیار کردہ موقف میں ضعف پایا جاتا ہے۔مثال کے طور پر 'قربانی کی حقیقت' کے عنوان کے ذیل میں مولانا نے یہ جملہ لکھا ہے:

> ''حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جو خواب دکھایا گیا تھا، اس سے مراد یہ تھی کہ بیٹے کو کعبے کی خدمت کے لیے نذر چڑھا دیں''۔ ۵۱؎

یہ موقف نہ صرف جمہور کے خلاف ہے، بلکہ اس میں ضعف اور کم زوری بھی پائی جاتی ہے۔اسی طرح غزوۂ بدر کے حوالہ سے جمہور محدثین اور اہلِ سیر اس پر متفق ہیں کہ نبی کریم ﷺ قریش کے قافلۂ تجارت سے تعرّض کے لیے نکلے تھے، مگر مولانا کا موقف یہ ہے کہ قافلۂ تجارت شام میں تھا اور ابوسفیان نے وہاں سے قریش کو حملے

کی اطلاع دی تھی۔ چنانچہ مولانا نے لکھا ہے: ''اس فیصلے میں عام مورخین اور اربابِ سیر میرے حریفِ مقابل ہیں''۔ ۵۲؎

مولانا شبلی کے اس تفرد پر مولانا شبیر احمد عثمانی (۱۸۸۶۔۱۹۴۹ئ) اور مولانا محمد ادریس کاندھلوی (۱۸۹۸۔۱۹۸۲ئ) نے کڑی تنقید کی ہے۔ ۵۳؎ ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی نے بھی اس پر تنقید کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''غزوۂ بدر کے سلسلے میں مولانا کے موقف کی کم زوری اور ان کے ضعفِ استدلال کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ واقعات کی تعبیر کے سلسلے میں انہوں نے صریح وصحیح روایات سے مکمل طور پر صرفِ نظر کرلیا ہے اور محض قیاس کی بنیاد پر واقعے کی ایک شکل فرض کرلی ہے''۔ ۵۴؎

اسی طرح حضرت ماریہ قبطیہؓ کے حوالہ سے مولانا کا موقف یہ ہے کہ آپؐ نے ان سے نکاح کیا تھا اور وہ آپؐ کی ازواجِ مطہرات میں سے تھیں۔ ۵۵؎ حالاں کہ یہ موقف جمہور کے مسلک کے خلاف ہے۔

(۵) نامناسب الفاظ کا استعمال

مولانا نے متعدد مقامات پر علماء کے لیے نامناسب الفاظ کا استعمال کیا ہے، جو ان کی علمیت اور ادبیت کے شایانِ شان نہیں۔ مثال کے طور پر انھوں نے حافظ ابن حجر عسقلانیؒ کو 'روایت پرست' ۵۶؎ اور واقدی کو 'مشہور کذّاب اور دروغ گو' لکھا ہے۔ ۵۷؎ اسی طرح بعض دیگر ائمہ کے لیے بھی نامناسب الفاظ استعمال کیے ہیں۔

(۶) معذرت خواہانہ اور مدافعانہ انداز

اگرچہ 'سیرۃ النبی' کی تالیف کا بڑا مقصد مستشرقین کے اعتراضات کا ردّ و ابطال تھا، مگر مولانا شبلی نے کہیں کہیں مستشرقین کے جواب میں مدافعانہ اور معذرت خواہانہ رویہ اختیار کیا ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے اس تعلق سے بجا طور پر لکھا ہے:

''سب سے پہلے تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ اپنے بار بار کے دعوے کے باوجود بہت سے مقامات پر شبلی کی رائے معذرت خواہانہ اور مدافعانہ ہے ۔شبلی نے مورخینِ یورپ کے اعتراضات سے دب کر آں حضرت ﷺ کے غزوات کے سلسلے میں ضرورت سے کچھ زیادہ ہی معذرت کا لہجہ اختیار کیاہے''۔ ۵۸؎

اور ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی کا تجزیہ یہ ہے:

''ان کے بہت سے بیانات اصلیت سے دور جا پڑے ہیں ۔ انہوں نے جابجا مسلّمات سے اختلاف وانحراف بھی کیا ہے۔ بہت سی جگہ ان پر تاویل وتوجیہ اور معذرت کا انداز بھی غالب آ گیا ہے اور ان سب کی وجہ یہ ہوئی ہے کہ وہ عہد، جس میں یہ کتاب لکھی گئی ، یورپین اقوام کی سیاسی وتہذیبی بالادستی کا تھا''۔ ۵۹؎

مولانا کے معذرت خواہانہ اور مدافعانہ رویے کی مثالیں قربانی کی حقیقت، تعدّدِ ازواج ، کنیزوں سے تمتع ،جنگی پیش قدمی، تجارتی قافلوں کو لوٹنا،غزوات جیسے موضوعات ومسائل میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ ۶۰؎

خلاصۂ کلام

مولانا شبلی کی سیرت نگاری کے اس مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ ان کی تصنیف 'سیرۃ النبی' جہاں اپنی خصوصیات کی بنا پر اہلِ علم کی توجہ کا مرکز رہی ہے، وہیں اس پر نقد وجرح بھی اہلِ علم کا موضوع رہا ہے۔شبلی کے انتقال کے چار (۴) سال بعد جب 'سیرۃ النبی' کی پہلی جلد شائع ہوئی تو اس کے بہت سے مقامات پر سب سے پہلے خود ان کے شاگردِ رشید مولانا سید سلیمان ندوی نے نقد کیا، انھوں نے بہت سے عنوانات کا اضافہ کیا، متعدد مقامات پر حواشی میں ان کے تسامحات کی جانب اشارہ کیا، اصل مآخذ سے دوبارہ رجوع کیا۔شبلی کی' سیرۃ النبی' پر نقدِ سلیمانی کے حوالے سے پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی نے ایک مضمون تحریر کیا ہے، جس کا عنوان ہے 'شبلی کی سیرت النبی کا مطالعہ: نقد سلیمانی

کی روشنی میں' ۶۱؎ اس میں موصوف نے انتہائی محنت سے ان تمام روایات اور مقامات کا تذکرہ کر دیا ہے جن میں ان دونوں کے اختلافات پائے جاتے ہیں۔ اسی طرح ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی، جناب عبد الحمید اور جناب یونس میو نے بھی ان پر نقد کیا ہے۔ ۶۲؎

اس کے باوجود یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ مولانا شبلی کی سیرت النبی گزشتہ صدی میں سیرت نبوی پر لکھی جانے والی بہترین تصنیف ہے۔ میں اس بحث کو پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی کے اس بیان پر ختم کروں گا:

> ''کم از کم اردو اور عربی میں تقریباً ستر سال گزر جانے کے باوجود اس سے بہتر سیرت نبوی پر کوئی کتاب نہیں لکھی گئی۔ وہ اپنی تحقیق و تدقیق، ترتیب و تبویب، بحث و تمحیص، تنقید و تنقیح، زبان و بیان و اسلوب و ادا اوران (سب) سے بڑھ کر تاریخی معیار سے ابھی تک 'اولین سیرت نبوی' ہے اور غالباً مدت تک اس پر کوئی اہم اضافہ نہیں کیا جا سکے گا''۔ ۶۳؎

حواشی و مراجع

۱۔ محمد اکرام، یادگار شبلی، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، ۱۹۹۴ئ، ص ۱۳۱۔ ۴۷

۲۔ ندوی، سید سلیمان، یاد رفتگاں، مجلس نشریات اسلام، کراچی، ۲۰۰۳ئ، ص ۲۹

۳۔ خان عبید اللہ خان (مرتب)، مقالات یوم شبلی، اردو مرکز، لاہور، ۱۹۶۱ئ، ص ۲۲۶۔

۴۔ انور محمود خالد، ڈاکٹر، اردو نثر میں سیرت نگاری، اقبال اکادمی، لاہور، ۱۹۸۹ئ، ص ۵۴۳،

۵۔ شبلی نعمانی، مکاتیب شبلی، نیشنل بک فاؤنڈیشن، لاہور، ۱۹۸۹ئ، ج ۱، ص ۲۳۸

۶۔ اردو نثر میں سیرت نگاری، ص ۵۴۴۔

۷۔ مقالات یوم شبلی، ص ۲۲۸۔

۸۔ مکاتیب شبلی، ج ۲، ص ۵۳۔

۹۔ ندوی، سید سلیمان، حیات شبلی، دار المصنفین، اعظم گڑھ، ۱۹۷۰ئ، ص ۶۳

۱۰۔ حوالۂ سابق، ص ۲۴۷ تا ۲۵۷۔

۱۱۔ سیدعبداللہ،ڈاکٹر،فن سیرت نگاری،فکرونظر(اسلام آباد)،اپریل۱۹۷۶ء،ص۱۲۔
۱۲۔ حوالۂ سابق،ص۱۱۔
۱۳۔ شبلی نعمانی،سیرۃ النبی،الفیصل ناشران و تاجران کتب،لاہور،۱۹۹۱ئ،ج۱،ص ۷۴
۱۴۔ حوالۂ سابق۔　۱۵۔ حوالۂ سابق،ص ۶۴۔
۱۶۔ حوالۂ سابق۔　۱۷۔ حوالۂ سابق۔
۱۸۔ حوالۂ سابق،ص ۶۵۔　۱۹۔ حوالۂ سابق۔
۲۰۔ حوالۂ سابق،ص۵۰ تا۵۱۔
۲۱۔ اردونثر میں سیرت نگاری،ص۵۹۵۔　۲۲۔ حوالۂ سابق۔
۲۳۔ سیرۃ النبی،ج۱،ص ۱۱۴۔　۲۴۔ حوالۂ سابق،ج۱،ص۳۲۲۔
۲۵۔ حوالۂ سابق،ج۱،ص ۲۷۲۔　۲۶۔ حوالۂ سابق،ج۱،ص۱۹۷۔
۲۷ حوالۂ سابق،ج۱،ص ۱۷۰۔
۲۸۔ صدیقی،ظفراحمد،ڈاکٹر،مولانا شبلی نعمانی بحیثیت سیرت نگار،دارالنوادر،لاہور،۲۰۰۵ئ،ص ۳۷
۲۹۔ حوالۂ سابق،ص ۴۳۔
۳۰۔ اردونثر میں سیرت نگاری،ص۵۸۸۔
۳۱۔ فن سیرت نگاری،ص۱۲
۳۲۔ اردونثر میں سیرت نگاری،ص۵۸۸ تا۵۸۹۔
۳۳۔ مولانا شبلی نعمانی بحیثیت سیرت نگار،ص۴۵۔
۳۴۔ سیرۃ النبی،ج۱،ص۲۳۔
۳۵۔ فن سیرت نگاری،ص۱۱۔　۳۶۔ حوالۂ سابق،ج۱،ص۱۷۔
۳۷۔ حوالۂ سابق،ج۱،ص ۳۷۔　۳۸۔ حوالۂ سابق،ج۱،ص ۲۷۔
۳۹۔ مولانا شبلی نعمانی بحیثیت سیرت نگار،ص ۴۷۔
۴۰۔ حوالۂ سابق،ص۴۹۔
۴۱۔ سیرۃ النبی،ج۱،ص ۴۷، ۱۷۳، ۳۴۰، ۲۸۷، ۲۹۲، ۱۵۷،۲۴۹،۲۵۱، ۲۶۳، ۲۴۴،۲۵۹، ۲۹۳، ۲۹۷، ۳۰۲، ۳۱۷
۴۲۔ سیرۃ النبی،ج۱،ص۱۳۳۔　۴۳۔ حوالہ سابق،ج۱،ص ۳۳۔
۴۴۔ حوالہ سابق،ج۱،ص۱۵۹۔

۴۵۔ اردو نثر میں سیرت نگاری،ص ۵۷۲۔
۴۶۔ مولانا شبلی نعمانی بحیثیت سیرت نگار،ص۶۷۔ ۴۷۔ حوالۂ سابق،ص ۱۶۳۔
۴۸۔ حوالۂ سابق،ص ۱۶۴۔
۴۹۔ حوالۂ سابق،ص۱۶۹۔
۵۰۔ سیرۃ النبی ،ج ۱،ص۱۲۹۔
۵۱۔ حوالہ سابق،ج ۱،ص ۱۰۰۔
۵۲۔ حوالہ سابق،ج ۱،ص ۲۱۰۔
۵۳۔ ملاحظہ کیجیے،مولانا شبیر احمد عثمانی کی تفسیر عثمانی،ص۲۹۹ اور مولانا ادریس کاندھلوی کی سیرۃ المصطفیٰ،ج ۱،ص ۶۳۴۔
۵۴۔ مولانا شبلی نعمانی بحیثیت سیرت نگار،ص۱۹۹۔
۵۵۔ سیرۃ النبی،ج ۱،ص ۲۸۳۔
۵۶۔ مولانا شبلی نعمانی بحیثیت سیرت نگار،ص ۲۳۲۔
۵۷۔ سیرۃ النبی ،ج ۱،ص۲۶۶۔
۵۸۔ فن سیرت نگاری ،ص ۱۳۔
۵۹۔ مولانا شبلی نعمانی بحیثیت سیرت نگار،ص ۲۳۷۔
۶۰۔ سیرۃ النبی ،ج ۱،ص ۱۰۰۔
۶۱۔ صدیقی ،محمد یٰسین مظہر، ڈاکٹر ،شبلی کی سیرت النبی کا مطالعہ: نقد سلیمانی کی روشنی میں، سہ ماہی تحقیقات اسلامی علی گڑھ،ج ۳،ش ۲،اپریل۔جون ۱۹۸۴ئ۔
۶۲۔ ملاحظہ کیجیے سید عبداللہ، ڈاکٹر،فن سیرت نگاری ،فکر ونظر (اسلام آباد)،اپریل ۱۹۷۶ئ،
صدیقی، ظفر احمد، ڈاکٹر،مولانا شبلی نعمانی بحیثیت سیرت نگار، دارالنوادر، لاہور،۲۰۰۵ئ،
عبدالحمید، شبلی نعمانی کی سیرۃ النبی میں موجود اسقام واغلاط ، ماہ نامہ نگار (لکھنو)، ۱۹۳۴ئ،
یونس میو، سیرۃ النبی کا تحقیقی وتنقیدی مطالعہ، ماہ نامہ القاسم (نوشہرہ) ،مئی ۲۰۰۵ئ۔
۶۳۔ شبلی کی سیرت النبی کا مطالعہ: نقد سلیمانی کی روشنی میں،ص ۵۷۔

☆☆☆

فیوض الحرمین — ایک مطالعہ

___________ مولانا کلیم صفات اصلاحی

فیوض الحرمین شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ (۱۷۰۳ئ۔ ۱۷۶۲ئ) کی ایک اہم اور اسلامی لٹریچر کی ایک منفرد اور مہتم بالشان تصنیف ہے۔ فکر ولی اللہی کے شارحین نے اس کے ساتھ خاص اعتناء کیا ہے۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ رقم طراز ہیں:

''یہ کتاب زیادہ تر قیامِ حجاز کے زمانہ کے مشاہدات، حقایقِ باطنی، مسایلِ کلامی اور مسایلِ تصوف سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ کتاب بھی خواص کے مطالعہ کی ہے، ان لوگوں کے دست رس سے بالاتر ہے جو فلسفہ اور تصوف میں پورا درک نہیں رکھتے۔''[۱]

سید محمد شاہ لکھتے ہیں:

''شاہ صاحب کو حرمین شریفین کے قیام کے دوران جو فیوضِ باطنی حاصل ہوئے اور جن حقائقِ عالیہ اور معارفِ جلیلہ کا اس اثنا میں آپ پر انکشاف ہوا اور جو ترقی مدارج آپ کو وہاں رہ کر نصیب ہوئی، ان کی کماحقّہٗ تفصیل تو خدائے عالم الغیب جانتا ہے، البتہ خود شاہ صاحب نے اپنی ایک جلیل القدر تصنیف 'فیوض الحرمین' میں، جو خاص اسی موضوع پر لکھی گئی ہے، اشارہ اور کنایہ سے اہلِ معرفت کی زبان میں کچھ کچھ باتیں سپردِ قلم فرمائی ہیں''۔[۲]

مولانا محمد منظور نعمانی اس کتاب کے متعلق فرماتے ہیں:

''برزمانۂ قیامِ حرمینِ شریفین حق تعالیٰ کی طرف سے جو الہامات یا روحِ پرفتوح پر سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے جو افاضات آپ کو ہوئے اور جو خاص تعلیم و تلقین کی گئی، آپ نے ان سب کو اس رسالہ میں جمع کر دیا ہے۔ قریباً سو صفحے پر اب سے بہت پہلے اردو ترجمہ کے ساتھ شائع ہو چکا ہے''۔[۳]

حجۃ اللہ البالغہ کے ایک اردو مترجم نے اس کتاب کے اجمالی تعارف کے ضمن میں لکھا ہے:

"اس کتاب میں شاہ صاحب نے وہ مسائل درج کیے ہیں جن کا آپ پر حضور ﷺ کی روحِ مبارک کے ذریعہ مدینہ منورہ کی اقامت کے دوران فیضان ہوا، مختصر مگر کثیر علوم پر مشتمل ہے"۔ [۴]

زمانۂ تصنیف

شاہ صاحب کی چند کتابوں کو چھوڑ کر تمام کتابوں کے زمانۂ تصنیف کے سلسلے میں علماء و محققین کے درمیان اختلاف ہے۔ ڈاکٹر مظہر بقا نے ان کے تصنیفی عہد کو چھ ادوار میں تقسیم کیا ہے اور فیوض الحرمین کو ۱۱۴۶ھ تک والے دوسرے دور کی تصنیفات میں شمار کیا ہے۔ [۵] پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی نے ان کی تصنیفات کے چار ادوار قائم کیے ہیں: (الف) زیارتِ حرمین سے قبل (ب) قیامِ حرمین کا عہد (ج) حرمین سے واپسی کے معاً بعد کا دور (د) تالیف کا آخری دور۔ انہوں نے فیوض الحرمین کو حرمین سے واپسی کے معاً بعد کی تصنیف قرار دیا ہے۔ [۶] لیکن شاہ ولی اللہ کے خلیفۂ اعظم، محبوب دوست اور عزیز ترین شاگرد شاہ محمد عاشق پھلتی نے، جو حرمین شریفین کے دورانِ قیام میں شاہ صاحب کے ساتھ تھے، القول الجلی میں لکھا ہے کہ یہ قیامِ حرمین شریفین کے زمانہ کی تصنیف ہے۔ القول الجلی فی ذکر آثار الولی شاہ صاحب کی زندگی ہی میں ان کے سوانح وملفوظات سے متعلق مرتب کی گئی تھی اور شاہ صاحب نے اس کا ایک ایک لفظ پڑھا تھا۔ شاہ محمد عاشق لکھتے ہیں:

"۱۵/ شعبان ۱۱۴۴ھ کو مکہ میں پہنچ کر عمرہ ادا فرمایا اور ماہ رمضان میں متعدد عمرے کیے اور آخری عشرہ میں بیت اللہ کے سامنے مسجد حرام میں اعتکاف فرمایا اور جب تک آپ مکۂ معظّمہ میں رہے، وہاں کے لوگ آپ سے فیوضِ ظاہری و باطنی اخذ کرتے رہے اور اسی جگہ آپ نے ایک رسالہ مسمی بہ 'فیوض الحرمین' تصنیف فرمایا۔ اس میں وہ تمام واردات وحقائق و

معارف و اسرار و غوامض، جو حرمین شریفین میں آپ پر وارد ہوئے تھے، بیان فرمائے ہیں، گو کہ بیش تر مضامین رسالۂ مذکورہ کے بہت بلند اور ہر شخص کے ادراک، بلکہ اہلِ معرفت کے وجدان سے بھی بالاتر ہیں"۔ ۷ ؎

مؤلف القول الجلی کے مذکورہ بالا بیان سے ثابت ہوتا ہے کہ فیوض الحرمین قیامِ حرمین کے عہد ۱۱۴۳ھ—۱۱۴۴ھ کی تصنیف ہے، حرمین سے واپسی کے معاً بعد کی تصانیف میں اس کو شمار کرنا اس کے سنۂ تصنیف کو دائرہ شک میں لاتا ہے، حالاں کہ قیامِ حرمین کی تصنیف قرار دینے کے لیے مصنف القول الجلی کا مستند بیان موجود ہے۔

وجہ ومقصدِ تصنیف اور نام

فیوض الحرمین کی تصنیف کی وجہ اور مقصد پر شاہ صاحب نے خود ہی اظہارِ خیال فرمایا ہے، چنانچہ اس کے مقدمہ میں حمد وثنا اور تمام انبیاء اور ان کی اولاد کی خدمت میں درود وسلام پیش کرنے کے بعد اس کے مقصد تصنیف پر روشنی ڈالتے ہوئے رقم فرماتے ہیں:

"اللہ تعالیٰ کا بڑا انعام ہے کہ اس نے مجھے حج بیت اللہ اور زیارتِ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی ۱۱۴۳ھ میں توفیق بخشی اور یہ نعمت بھی میسر آئی کہ میرا حج مشاہدہ اور معرفتِ الٰہی کے ساتھ ہوا، کوئی حجاب اور کسی قسم کی رکاوٹ پیش نہیں آئی، اسی طرح زیارت بھی زیارتِ مبصرہ ہوئی، اندھوں والی زیارت نہیں ہوئی۔ سو یہ زیارتِ شریفہ میرے نزدیک تمام نعمتوں سے بڑھ کر ہے۔ اس لیے مناسب سمجھا کہ ان تمام مشاہد کے اسرار، جو کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے القا فرمائے ہیں، لکھ لوں اور اسی طرح، جیسا کہ مجھے روحانیتِ رسول اکرم ﷺ سے فوائد حاصل ہوئے، ان کو بھی ضبطِ تحریر کرلوں، تاکہ یہ چیز میرے لیے باعثِ تذکیر و یاددہانی اور میرے بھائیوں کے لیے بصیرت کے فرائض انجام دے۔ امید ہے کہ اس تالیف سے کچھ شکر ادا ہوجائے۔ میں نے اس رسالہ کا نام 'فیوض الحرمین' رکھا ہے۔ ۸ ؎

ہمارے پیشِ نظر فیوض الحرمین کا جونسخہ ہے وہ کراچی کا مطبوعہ ہے۔اس کے اردو مترجم مولانا عابد الرحمن صدیقی کاندھلوی ہیں۔ترجمہ اصل عربی عبارت کے سامنے ہے، اس لیے اس کی ضخامت زیادہ ہے۔ اس میں کل تین سو ستائیس (۳۲۷) صفحات ہیں۔ آغازِ کتاب میں نو (۹) صفحات پر مشتمل خواجہ عبدالوحید کا مقدمہ ہے۔صفحہ اٹھارہ (۱۸) سے اصل کتاب شروع ہوکر صفحہ تین سو ستائیس (۳۲۷) پر ختم ہوتی ہے۔

اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ شاہ ولی اللہؒ علومِ ظاہری و باطنی دونوں میں مرتبۂ کمال پر فائز تھے۔ انہوں نے ایک طرف قرآن، حدیث ، فقہ، فلسفہ، منطق، تصوف، علم کلام وغیرہ علومِ ظاہری میں اپنے درک ودست رس کے ثبوت فراہم کیے ہیں تو دوسری طرف انفاس العارفین، القول الجلی ، الطاف القدس، الانتباہ، البلاغ المبین، بوارق الولایۃ، خیر کثیر، تفہیمات الٰہیہ، سطعات، عوارف، القول الجمیل، لمعات اور فیوض الحرمین وغیرہ قلم بند کر کے علومِ باطنی کے اسرار ورموز کی پردہ کشائی کی ہے۔زیرِ مطالعہ کتاب (فیوض الحرمین) شاہ صاحب کے حقائق باطنی کے انکشافات ومشاہدات پر مبنی ہے۔ اس میں کل سینتالیس (۴۷) مشاہداتِ باطنی کا تذکرہ ہے، جن کی تفصیل آگے آرہی ہے۔ یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ بعض مشاہد کے ذیل میں 'تحقیقِ شریف' اور 'معرفتِ عظیمہ' کے عنوان سے انھوں نے ان حقایقِ باطنی کی تشریح عام فہم انداز میں کردی ہے، جس سے قاری کا ذہن ان کے مدّعا کی طرف بہ آسانی منتقل ہوجائے۔ ان ۴۷ مشاہد میں ہر مشہد ایک عنوان کے تحت ہے۔وہ عناوین درج ذیل ہیں:

(۱) مشہد یعنی اربابِ فکر واصحابِ ذکر (۲) تدلّی کی حقیقت (۳) اللہ تعالیٰ کے شعائر کا نور بلند ہوتا ہے (۴) تدلّی سے اللہ تعالیٰ کا قرب آسان ہوجاتا ہے (۵) ملکۂ دعا حاصل ہونے کے بعد داخلۂ ملأ اعلیٰ (۶) ایک غیبی اشارہ (۷) ایمان کی قسمیں (۸) رحمتِ الٰہی کے بعد نفس پر کیا کیفیت طاری ہوتی ہے؟ (۹) انبیاء کرام اپنی قبروں میں زندہ ہیں (۱۰) شفاعت کا ثبوت (۱۱) آں حضرت ﷺ رحمۃ للعالمین اور خاتم النبیین ہیں (۱۲) آں حضرت ﷺ کو تمام انبیاء پر فوقیت حاصل

ہے(۱۳) روضۂ انور اور منبرِ مبارک کے انوار اور برکات (۱۴) روحِ مبارک ﷺ کی عظمت (۱۵) شاہ ولی اللہ آخری نقاطِ علم ہیں (۱۶) حقیقتِ محمدیہ ﷺ (۱۷) شاہ صاحب کا سالک بننا (۱۸) مشہدِ آخر (۱۹) مذہبِ حنفی کا بہترین طریقہ (۲۰) روضۂ اطہر کے انوار تمام انوار سے فائق ہیں (۲۱) علمائے کرام کا مقام رسول اللہ ﷺ کے نزدیک بہت بلند ہے (۲۲) حضرت ابوبکر صدیقؓ اور عمر فاروقؓ کو کیوں فضیلت حاصل ہے؟ (۲۳) رسول اکرم ﷺ پر اللہ تعالیٰ کی خصوصی نظر (۲۴) انسان محدث بنے یا اس کا طفیلی؟ (۲۵) عارف کے کامل ہونے کے بعد اس کی روح ملأ اعلیٰ سے جا کر مل جاتی ہے (۲۶) کامل المعرفۃ کو ہمہ قسم کی نعمتیں ملتی ہیں (۲۷) **وھو القاھر فوق عبادہ** کا مطلب (۲۸) اللہ پیغمبر کی طرف کتاب نازل کرتے وقت کیا کرتا ہے؟ (۲۹) **قَدَمَ صِدقٍ عند ربھم** کی تفسیر (۳۰) نورِ عرش (۳۱) فقہ حنفی اکسیر اعظم اور کبریتِ احمر ہے (۳۲) ائمہ اہلِ بیت کا عجیب طریقہ (۳۳) تفضیلِ شیخین کا حکم (۳۴) نورِ ارشادیت (۳۵) بیتِ عتیق کا منظر (۳۶) شاہ ولی اللہ کو من جانب اللہ ولایت کا عطا ہونا (۳۷) ملأ اعلیٰ کے اسرار عارف کی روح میں حلول کرتے ہیں (۳۸) کمالِ انسانی کس وقت متحقق ہوتی ہے؟ (۳۹) انسان اللہ تعالیٰ کا قرب کس وقت حاصل کرسکتا ہے؟ (۴۰) روح کی حقیقت (۴۱) انسان میں شرافت اور بزرگی موروثی نہیں (۴۲) جنتیوں اور دوزخیوں کا لباس (۴۳) ولی کو خلعتِ قطبیت کس وقت پہنایا جاتا ہے؟ (۴۴) شہر اجمیر میں کفر کی باتوں کا رواج (۴۵) رقائق اور ان کے اثرات (۴۶) ہندوستان میں مذہبِ حنفی کی ضرورت اور اس کی حقانیت (۴۷) غبی ہو یا ذکی، ہر ایک صراطِ مستقیم پر قائم ہوسکتا ہے۔

یہ تو شاہ صاحب کی تصنیف 'فیوض الحرمین' میں مکمل مشاہد کی ایک فہرست ہے۔ اب ان مشاہد کا ذکر کیا جاتا ہے جن کے ذیل میں شاہ صاحب نے معرفتِ عظیمہ اور تحقیقِ شریف کے عنوان کے تحت تفصیلات لکھی ہیں:

شاہ صاحب نے مشہد ۲ یعنی تدلّی کی حقیقت کے تحت معرفتِ عظیمہ، تحقیقِ

شریف اور زاید ایضاح یعنی وجدان کی حقیقت پر مفصلاً روشنی ڈالی ہے۔اس کے بعد مشہدے یعنی ایمان لانے کی قسمیں بیان کرنے کے بعد اولیاء اللہ کے الہام پر گفتگو کی ہے۔مشہد ۱۱ کے تحت 'تحقیق شریف' کے عنوان سے اس سوال کو حل کیا ہے کہ زمانۂ سابق میں حضرت آدمؑ کے بعد لوگ کند ذہن، جامد طبع اور حیوان صفت کیوں ہو گئے؟ مشہد آخر یعنی اٹھارہویں مشہد کے ذیل میں حقیقتِ طریق یعنی سلوک کی حقیقت بتائی ہے۔مشہد ۳۶ کے تحت دو تحقیقیں درج ہیں: ایک میں عارف باللہ پر آنے والی نعمتوں کے کشف کا ذکر ہے اور دوسری میں رسول اللہ ﷺ اور آپؐ کے خلفاء کی ضرورتِ اتباع کی حکمت کی تفصیل ہے۔ پھر مشہد ۳۸ کے تحت تین تحقیقیں ہیں: پہلی حدیث **لایردّ القضاء الاالدعاء**، دوسری 'علی الاطلاق اللہ تعالیٰ کی تنزیہ واجب ہے' اور تیسری تحقیق 'تمثیل' کے عنوان کے تحت ہے،جس میں ارادۂ الٰہی کومخلوقات کی وجہ سے ظاہر ہونا قرار دیا گیا ہے۔اس کے بعد مشہد ۴۰ یعنی روح کی حقیقت کے تحت جو تحقیق شاہ صاحب نے درج کی ہے، اس میں بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے صرف دنیا میں لطف و رحمت کا ارادہ نہیں کیا ہے، بلکہ آپؐ کی وجہ سے قیامت کے دن بھی عام رحمت کا ارادہ فرمایا ہے۔مشہد ۴۵ کے ضمن میں انھوں نے تین تحقیقیں درج کی ہیں: ایک میں رسول اللہ ﷺ کو حجابِ اعظم قرار دینے کی تعبیر کے سلسلہ میں سید عبد السلام بن بشیش کے قول کی تشریح، دوسری میں کاملین کے لیے ذات کی طرف وصول بالفعل ہونا اور تیسری میں اللہ تعالیٰ کو اشیاء کا علم اجمالاً وتفصیلاً حاصل ہونا ثابت کیا ہے۔ ۴۷ویں یعنی آخری مشہد کے تحت ایک تحقیق ہے،جس میں شاہ صاحب نے ثابت کیا ہے کہ انسان کے ہر فعل (کام) کی وجہ پہلے سے مقدّر ہے۔

یہاں یہ ذکر کردینا مناسب ہوگا کہ شاہ صاحب نے جن مشاہد کے ذیل میں تحقیق شریف یا معرفتِ عظیمہ تحریر کیا ہے وہ دراصل ان ہی مشاہد کے اجمال کی شرح اور ایجاز کا اطناب ہے، تاکہ قاری ان مشاہد کی باریکیوں اور تفصیلات سے واقف

ہو جائے اور شاہ صاحب کے الہامات اور حقایقِ باطنی کھل کر سامنے آ جائیں۔ اگر چہ عام ذہن رکھنے والے لوگوں اور تصوف و فلسفہ اور کلامی مسائل سے دل چسپی نہ رکھنے والوں کے لیے شاہ صاحب کے حقائقِ باطنی کی یہ وادیاں غیر مانوس ہیں، تاہم دورِ حاضر کا ترقی پذیر ذہن جس طرح باریک سے باریک ترین حقائق اور انتہائی پوشیدہ رازوں سے پردہ اٹھا رہا ہے، ممکن ہے آئندہ زمانوں میں باطنی احساسات اور روحانی علوم کے بند دروازے وا ہوں۔ اس وقت شاہ صاحب کی تحقیقاتِ باطنی کی واقعیت اور اہمیت بلا شبہ بڑھ جائے گی۔ تقی انور علوی لکھتے ہیں:

> ''حضرت اقدس (شاہ ولی اللہ) نے اپنے جو مکاشفات، واقعات، واردات، الہامات، مشاہدات بیان کیے ہیں، وہ اب زیادہ محیّر العقول و ناممکن نہیں، کیوں کہ مادی دنیا میں علم طبیعیات کی ترقی نے ایسی حیرت انگیز چیزیں ایجاد کر دی ہیں کہ آج سے پچاس (یا ستّر سال) سال قبل اگر کوئی ان کی پیشین گوئی کرتا تو لوگ اس کو فاتر العقل سمجھتے، فضا کی لہروں سے اس کو مسخّر کر کے انسانی ذہن نے وہ وہ کرشمے رچائے ہیں کہ طلسمِ ہوش ربا کی خیالی چیزیں بھی اب حقیقت بن کر سامنے آ گئی ہیں اور اہلِ بصیرت عالمِ حیرت میں ہیں۔ اب دنیا کہاں سے کہاں جائے گی اور ذہنِ انسانی کیا کیا کرشمے دکھائے گا اور طلسم رچائے گا، یہ فی الوقت ہماری فہم سے بالاتر ہے۔ نہ معلوم کیا کیا چیزیں ہوتی ہیں اور ہوں گی، جو انسان کے حاشیۂ خیال میں نہیں آ سکتیں۔''[۹]

اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ شاہ صاحب کے یہ الہامات عام ذہن کے درک و فہم سے بالاتر ہیں، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان سے استفادہ نہیں کیا جا سکتا۔ ان میں سیرت، تصوف اور قرآن و حدیث سے متعلق بہت سی ایسی چیزیں ہیں جو فکرِ ولی اللہی کو سمجھنے کی راہ آسان کرتی ہیں، دوسری بات یہ کہ اگر کسی مفکر و مجدد کی باتیں سمجھ میں نہ آئیں تو ان پر نکیر و اعتراض کرنے کے بجائے انھیں دوسرے لوگوں پر چھوڑ دینا چاہیے۔ خود شاہ صاحب نے لکھا ہے:

”اگر مجدّد (وقت) کی بات سمجھ میں نہ آئے تو اس پر اعتراض ونکیر نہ کرنا چاہیے، بلکہ دوسرے آنے والے مجدّد پر چھوڑ دینا چاہیے (کہ وہ وضاحت کرے گا) کیوں کہ مجدد کی بات انبیاء علیہم السلام کی بات کے مثل خطا و غلط فکر سے پاک ہوتی ہے“۔ ۱۰؎

بہر حال بعض وہ مباحث جو بہ آسانی سمجھے جاسکتے ہیں اور جن کا ذکر شاہ صاحب نے اپنی اس مہتم بالشان تصنیف میں کیا ہے، ذیل میں نقل کیے جاتے ہیں، جن سے شاہ صاحب کے علومِ باطنی و ظاہری میں کمال کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ سے براہِ راست تلمّذ کا دعویٰ

شاہ صاحب نے اپنے متعلق فیوض الحرمین میں متعدد دعوے کیے ہیں، جو عام افراد کے لیے حیرت ناک وتعجب انگیز ہیں، لیکن صوفیۂ کرام کے نزدیک چنداں تعجب انگیز نہیں۔ شاہ صاحب فیوض الحرمین میں فرماتے ہیں:

سلکنی رسول اللہ ﷺ بنفسه و ربّانی بیده ،فأنا أویسیه و تلمیذه بلا واسطة بینی و بینه، وذلک أنّه رآنی ﷺ روحه المکرّمة فعرفنی بها۔ ۱۱؎

”مجھے خود رسول اللہ ﷺ نے سالک بنایا اور آپ نے بذاتِ خود میری تربیت فرمائی۔ لہٰذا میں آپؐ کا اویسی اور بہ راہِ راست شاگرد ہوں۔ یہ بات میں اس لیے کہہ رہا ہوں کیوں کہ آپؐ کی روحِ مبارک میرے سامنے جلوہ گر ہوئی اور خود سے میری پہچان کروائی۔“

اس کے بعد شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ ” میرے نزدیک رسول اللہ ﷺ کی روحِ مبارک **أعرف الأشیاء**، یعنی اشیاء کو سب سے زیادہ پہچاننے والی ہے اور اشیاء ہی نہیں، بلکہ محسوسات میں بھی خاصا درک رکھتی ہے۔ آپؐ کے وجود سے سب سے پہلے مجھ پر ایک تجلی ظاہر ہوئی، میں نے اس تجلی کو اپنے جوہر سے قبول کیا اور اس میں مستغرق اور فنا ہوگیا۔“ ۱۲؎

مذاہبِ اربعہ کی تقلید کے لیے رسول اللہ ﷺ کی وصیت

اسی کتاب میں ایک جگہ شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے میں نے تین باتوں کا استفادہ کیا ہے، جو میرے اپنے مزاج وطبیعت کے خلاف تھیں: ان میں سے ایک بات یہ کہ میں مذاہبِ اربعہ کی تقلید کروں اور ان سے باہر قدم نہ رکھوں۔ فرماتے ہیں:

و استفدت منه ﷺ ثلاثة أمور خلاف ما كان عندي وما كانت طبيعتي ...ثانيها الوصاة بالتقليد بهذه المذاهب الأربعة لا أخرج منها والتوفيق ما استطعت۔ [۱۳]

''میں نے اپنی طبیعت کے خلاف تین چیزوں کا رسول اللہ ﷺ سے استفادہ کیا ہے:۔۔۔ان میں سے دوسری یہ ہے کہ میں مذاہبِ اربعہ کی تقلید سے باہر قدم نہ رکھوں اور ان میں جہاں تک ممکن ہو، تطبیق دوں۔''

مذاہبِ اربعہ کی تقلید اور مصلحت کا راز شاہ صاحب نے اپنی کتاب 'عقد الجید' میں کھولا ہے کہ چوں کہ عام انسانوں کی فلاح و بہبود بڑی حد تک اسی بات پر موقوف ہے کہ چاروں مذاہب میں سے کسی کی پیروی کی جائے، خصوصاً اب آخری دور میں، جب کہ امانتوں کا کوئی لحاظ نہیں رکھا جاتا، علمائے سوء پر مکمل اعتماد صحیح نہیں ہے۔ **(وانّ في الأخذ بهذه المذاهب الأربعة مصلحة عظيمة من وجوه، لأنّ الزمان لما طال و بعُد العهد وضُيّعت الأمانات لم يجز ان يعتمد على أقوال علماء السوء)** [۱۴]

خلافتِ باطنی و ظاہری کے سلسلہ میں شاہ صاحب کا موقف

آج سیاسیات کی گرم بازاری اور مادیات سے دل چسپی کا اثر اس قدر ہو گیا ہے کہ دینی اور علمی کاموں کی کوئی اہمیت بعض حلقوں کو نہیں محسوس ہوتی، بلکہ ان کی اصل دل چسپیاں صرف مادی اور دنیوی عیش وعشرت تک محدود ہیں، لیکن فیوض الحرمین کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحب اس معاملہ میں معتدل نقطۂ نظر رکھتے تھے۔ انہیں مادی اور دنیوی چیزوں کا احساس تھا اور ساتھ ہی مذہبی اور دینی

کاموں کی بھی دل سے قدر کرتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ رسول اللہ ﷺ کے متبعین و مبلغین کے لیے دو راستے ہیں: خلافتِ ظاہری و خلافتِ باطنی۔ اور دونوں اپنی اپنی جگہ مفید اور ضروری ہیں۔ فرماتے ہیں:

> ''رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں امت کے لیے صالح نمونۂ عمل موجود ہے، مثلاً خلافت ظاہری والوں کے لیے جو شرعی حدود اور جہاد کے ساز و سامان کی تیاری اور سرحدی علاقوں کی ناکہ بندی و حفاظت اور وفود کو اکرام و انعام دینے کی خدمت اور صدقات، محصول، مال گزاری وغیرہ کی وصولی، اربابِ حق تک ان کی رسائی، مقدمات کا تصفیہ، یتیموں کے اموال کی نگرانی، مسلمانوں کے اوقاف کا انتظام، راستوں، سڑکوں اور مساجد وغیرہ کی دیکھ بھال اور اسی قسم کے اور کاموں کے لیے مقرر ہیں، مسلمانوں میں جو ان خدمات میں مصروف ہیں، ان کو میں خلافت ظاہری والوں سے موسوم کرتا ہوں۔
> جو لوگ باطنی خلافت والے ہیں، یعنی جو اس کام پر مقرر ہیں کہ شرایع اور قوانینِ اسلامی، قرآن و سنن و آثار کی تعلیم دیں اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کریں، وہ لوگ جن کے کلام سے دین کی تائید ہوتی ہے، خواہ مباحثہ و مناظرہ کی راہ سے، جیسا کہ متکلمینِ اسلام کا طریقہ ہے، یا وعظ و پند کے طریقے سے، جیسا کہ اسلام کے مقررین اور خطباء اس خدمت کو انجام دیتے ہیں، یا وہ لوگ جو اپنی صحت اور توجہ و ہمت سے اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کرتے ہیں، جیسا کہ مشائخ صوفیہ کا حال ہے، اسی طرح جو نمازیں قائم کراتے ہیں، حج کراتے ہیں اور جو انسان (دوام حضور) کے حصول کی راہ لوگوں کو بتاتے ہیں اور زہد و تقویٰ کی طرف لوگوں کو بلاتے ہیں، ان کو ہم خلفائے باطنی کے نام سے موسوم کرتے ہیں''۔ ۱۵؎

اولیاء اللہ کا الہام

تصوف و سلوک کو انسانی زندگی میں اہم مقام حاصل ہے، لیکن اس حقیقت

سے بھی انکار مشکل ہے کہ متاخرینِ صوفیہ نے بہت سی لغویات وخرافات اس میں شامل کر کے اس کے نورانی چہرہ کو داغ دار کرڈالا ہے۔نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ بعض صوفیہ کے عقائد واعمال اہلِ بصیرت کے نزدیک ناقابلِ اعتنا قرار پائے اور تصوف وسلوک کی اہمیت ان کے دل سے ختم ہوگئی، حالاں کہ اگرغور سے دیکھا جائے تو تصوف دراصل دین کے باطنی امور سے واقف ہونے کا نام ہے اور اس کا مقصد عبادت اوراطاعت کے اثرات سے حاصل شدہ روشنی کی تحصیل ہے۔ انسان کی سب سے بڑی کام یابی یہ ہے کہ اس کا باطن بیرونی واندرونی آلائشوں سے پاک ہو۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ کا شمار بلا شبہ شریعت وطریقت دونوں علوم کے ماہرین میں ہوتا ہے۔ انہوں نے تصوف کی حقیقت پر بیش بہا مواد فراہم کیا ہے۔ فیوض الحرمین میں انہوں نے جگہ جگہ اصلی تصوف پر،جس کا مقصد تزکیۂ باطن ہے، روشنی ڈالی ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے ایک جگہ 'تحقیق شریف: اولیاء اللہ کا الہام' کے عنوان کے تحت جومضمون قلم بند کیا ہے وہ اولیاء اللہ کے الہام کی حقیقت واضح کرتا ہے۔اس کے تحت انہوں نے اپنے عم محترم کا بیان نقل کیا ہے کہ انہیں اس بات کا الہام ہوا تھا کہ ان سے تکلیفِ شرعی معاف کردی گئی۔ان سے کہا گیا کہ اگر عبادت کے پیچھے جہنم کا خوف ہے تو ہم نے تمہیں نجات دی اور اگر جنت کی خواہش ہے تو ہم تمہیں جنت میں ضرور داخل کریں گے۔ انہوں نے جواب دیا کہ ''اے پروردگار! میں تیری عبادت تیری ذات کے علاوہ اورکسی چیز کے لیے نہیں کرتا۔''[۱۶]

ظاہر ہے، اس الہام کی شرعی حیثیت پر گفتگو طوالت کا باعث ہوگی، قارئین اس سلسلے میں اپنے ذوق و وجدان کے مطابق خود فیصلہ فرمائیں، تاہم ان کے جواب کی معقولیت پر شبہہ نہیں کیا جاسکتا۔اس لیے کہ عبادات کا بنیادی نکتہ یقیناً اللہ کی رضا و خوش نودی ہی ہے۔

مختصر یہ کہ شاہ صاحب کی یہ قابل قدر تصنیف مطالعہ کے لائق ہے۔اس میں تصوف کے علاوہ قرآن، حدیث،سیرت،فقہ،فلسفہ وعلم کلام اور عقائد اسلامی کے

رموز و اسرار کی گرہ کشائی بڑے دل نشیں انداز میں کی گئی ہے۔ خاص طور پر اس سے فقہ کے سلسلے میں شاہ صاحب کے مسلکِ اعتدال سے واقفیت حاصل ہوتی ہے۔ تفضیلِ شیخین کے موضوع پر بھی شاہ صاحب کی بحث بہت عمدہ ہے۔ ان کے علاوہ اس کتاب سے دیگر اور بہت سے موضوعات پر شاہ صاحب کے نقطیہ نظر کی وضاحت ہوتی ہے۔

حواشی و مراجع

۱۔ تاریخ دعوت وعزیمت، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ جلد پنجم ص ۴۰۷۔

۲۔ ماہ نامہ پیام حق لاہور، اگست ۱۹۴۸ئ، جلد ۱۴، عدد ۲، ص ۱۸

۳۔ ماہ نامہ الفرقان، شاہ ولی اللہ نمبر، رمضان تا ذی الحجہ ۱۳۵۹ھ، ص ۳۸۷

۴۔ حجۃ اللہ البالغہ، مترجم اردو، مطبوعہ دیوبند، ص ۱۳

۵۔ اصول فقہ اور شاہ ولی اللہ، ادارہ تحقیقات اسلامی، پاکستان ۱۹۷۳ئ، ص ۵۷ تا ۸۵

۶۔ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ شخصیت وحکمت کا ایک تعارف، پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی، ادارۂ علوم اسلامیہ، علی گڑھ، ص ۱۵

۷۔ القول الجلی، اردو ترجمہ، نامی پریس لکھنؤ ۱۹۸۸ئ، ص ۶۳

۸۔ فیوض الحرمین، مطبع سعید، کراچی، سنہ اشاعت درج نہیں، ص ۲۰۔

۹۔ مقدمہ القول الجلی (اردو ترجمہ)، مطبوعہ لکھنؤ، ۱۹۸۸ء ص ۲۷۔ ۳۷،

۱۰۔ حوالۂ سابق، ص ۳۷

۱۱۔ فیوض الحرمین، ص ۱۲۶، مشہد ۱۷

۱۲۔ حوالۂ سابق، ص ۱۲۷

۱۳۔ حوالۂ سابق، ص ۱۸۷۔ ۱۸۶، مشہد ۳۳۔

۱۴۔ عقد الجید، ص ۳۱

۱۵۔ فیوض الحرمین، مشہد ۳۶ (مزید تحقیق شریف ص ۱۹۶۔ ۱۹۷۔)

۱۶۔ حوالۂ سابق، ص ۲۷

☆☆☆

بحث ونظر

توحیدِ خالص کا تصور

(صحفِ سماوی میں)

__________ جناب محمد افضل

الہامی مذاہب میں عقیدہ توحید کو اہم اور نمایاں مقام حاصل ہے۔ توحیدِ الوہیت تمام انبیاء کرام علیہم السلام کی تعلیمات کا مرکزی نکتہ تھا۔ یہی وہ اساسی مسئلہ ہے جو حق اور باطل کے مابین وجہِ نزاع رہا ہے۔ یہی ایمان کی اصل اور اعمال صالحہ کی روح ہے۔ اسی کی بدولت انسان اللہ تعالیٰ کے حق اور اپنے فرائض سے روشناس ہوتا ہے۔ اسی لیے تورات، انجیل اور قرآن مجید میں توحیدِ الوہیت کی عام فہم انداز میں تشریح وتوضیح فرمائی گئی ہے، تا کہ ان کتب کے حاملین اللہ تعالیٰ کی ذات، صفات اور عبادات میں تصوّر وحدانیت سے اچھی طرح واقف ہوجائیں اور کسی قسم کے شرک میں مبتلا نہ ہوں۔ لیکن بد قسمتی سے یہود ونصاریٰ میں مشرکانہ نظریات نے جنم لیا اور انہوں نے عقیدۂ ابنیت، عقیدۂ تثلیث اور دیگر شرکیہ عقائد کو اختیار کرلیا، جن کا تورات اور انجیل مقدس میں وجود نہیں ہے۔ دوسری طرف مسلمانوں کا بھی ایک طبقہ اپنی جہالت کی وجہ سے توحیدِ الوہیت سے بے خبری اور غفلت کا مظاہرہ کر رہا ہے اور شرک کی مختلف صورتوں میں مبتلا ہے، جب کہ توحید باری تعالیٰ کی دعوت تمام انبیاء ورسل کی تعلیمات میں رہی ہے۔ قرآن مجید میں یہود ونصاری کو مخاطب کر کے انھیں دعوت دی گئی ہے:

قُلْ يَآأَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا إِلَى كَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلاَّ نَعْبُدَ إِلاَّ اللّٰهَ وَلاَ نُشْرِكَ بِهِ شَيْئاً وَلاَ يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضاً أَرْبَاباً مِّن دُونِ

اللّٰہِ فَإِن تَوَلَّوْاْ فَقُولُواْ اشْهَدُواْ بِأَنَّا مُسْلِمُونَ

(آل عمران: ۶۴)

”کہہ دیجئے اے اہل کتاب ! آؤ ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے، یہ کہ اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں اور ہم میں سے کوئی اللہ کے سوا کسی کو اپنا رب نہ بنالے۔ اس دعوت کو قبول کرنے سے اگر وہ منہ موڑیں تو صاف کہہ دو کہ گواہ رہو، ہم تو مسلم (صرف اللہ کی بندگی و اطاعت کرنے والے) ہیں“۔

توحید اور عبادتِ الٰہی

انبیاء و رسل کی بعثت، صحفِ سماوی کے نزول، شریعتوں کے تقرر اور جن و انس کی تخلیق کا واحد مقصد یہی تھا کہ اللہ عزّ وجل کو اس کی ذات اور عبادت میں یکتا تسلیم کیا جائے۔ الہامی کتب میں جگہ جگہ اس کی صراحت کی گئی ہے۔

تورات میں توحید فی الذات اور توحید فی العبادۃ کی بالتفصیل وضاحت کی گئی ہے اور ان تمام اعمال و افعال سے منع کیا گیا ہے جن سے اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کی عبادت میں حصہ داری یا ساجھا پن کا تصوّر جنم لے سکتا ہے۔ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کی دعوت ان الفاظ میں نقل کی گئی ہے:

اِنَّمَآ اِلٰـهُكُمُ اللّٰهُ الَّذِىۡ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ‌ؕ وَسِعَ كُلَّ شَىۡءٍ عِلۡمًا

(طہٰ:۹۸)

”لوگو، تمہارا خدا تو بس ایک ہی اللہ ہے جس کے سوا کوئی اور خدا نہیں ہے، ہر چیز پر اس کا علم حاوی ہے“۔

یہودیت میں توحیدِ الٰہی کو بہت مقدم رکھا گیا ہے اور اللہ تعالیٰ کی ذات میں وحدانیت کو بہت واضح الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

”خداوند ہی خدا ہے اور اس کے سوا کوئی ہے ہی نہیں“۔

(استثنائ: ۴: ۳۵)

تورات ہی میں دوسری جگہ ان اشیاء کی نفی کی گئی ہے جن کی اس کی ذات اور صفات کے ساتھ تشبیہ دی جاتی تھی:

''میرے مقابلے میں تمہیں کسی دوسرے خدا پر ایمان نہیں لانا چاہیے۔ اور تمہیں کسی چیز کی بھی تشبیہ گھڑنی نہیں چاہیے یا کسی بھی ایسی چیز کی شکل جو آسمانوں میں ہو، یا زمین کے نیچے پانی میں ہو، اور نہ ہی تمہیں ان کے آگے سجدہ کرنا چاہیے اور نہ ہی ان کی پوجا کرنی چاہیے، کیوں کہ میں تمہارا خدا ابدآباد خدا ہوں اور غیرت مند خدا ہوں''

(استثنائ:۵:۷)

قرآن مجید میں بھی اس بات کی صراحت موجود ہے کہ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو توحید کی تعلیم دی تھی اور شرک کی سختی سے ممانعت فرمائی تھی:

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ۭ وَقَالَ الْمَسِيْحُ يٰبَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ ۭ اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَاْوٰىهُ النَّارُ ۭ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ۔ (المائدۃ: ۷۲)

''یقیناً کفر کیا ان لوگوں نے جنہوں نے کہا کہ اللہ مسیح ابنِ مریم ہی ہے، حالاں کہ مسیح نے کہا تھا کہ اے بنی اسرائیل !اللہ کی بندگی کرو جو میرا رب بھی ہے اور تمہارا رب بھی ۔جس نے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھیرایا اس پر اللہ نے جنّت حرام کر دی اور اس کا ٹھکانا جہنّم ہے اور ایسے ظالموں کا کوئی مددگار نہیں''۔

نیز اللہ عز وجل کا ارشاد ہے:

وَاِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ۭ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ۔

(مریم:۳۶)

''(اور عیسیٰ [علیہ السلام] نے کہا تھا کہ) اللہ میرا رب بھی ہے اور تمہارا رب بھی، پس تم اس کی بندگی کرو، یہی سیدھی راہ ہے''۔

انجیل اس بات پر شاہد ہے کہ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات دیگر انبیاء

سے مختلف نہ تھیں۔اس میں ہے کہ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا تھا:

"اے اسرائیل !سن، خداوند ہمارا خدا ایک ہی خدا ہے"۔

(مرقس،۱۲: ۲۹)

سیدنا عیسیٰ علیہ السلام نے توحیدِ الوہیت کا جو تصور پیش کیا تھا وہ اسلام کی تعلیمات سے کچھ مختلف نہ تھا۔انجیل متی میں ہے:

"تو خداوند اپنے خدا کو سجدہ کر اور صرف اس کی عبادت کر"۔

(متی، ۴: ۱۰)

سیدنا عیسیٰ علیہ السلام اپنے پیروکاروں میں عقیدۂ توحید کی کس قدر پختگی چاہتے تھے، اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ آپ کو 'نیک استاد' کہا گیا تو آپ نے جواب میں فرمایا:

"تو مجھے کیوں نیک کہتا ہے؟ کوئی نیک نہیں، مگر ایک یعنی خدا"۔

(مرقس،۱۰: ۱۸)

نجاتِ اخروی کی پہلی شرط توحید ہے۔اگر عقیدۂ توحید نہیں ہے تو نیک اعمال بے کار ہیں اور ان کی کوئی وقعت نہیں ہے۔انجیل یوحنا میں اس کی صراحت ان الفاظ میں کی گئی ہے:

"ہمیشہ کی زندگی یہ ہے کہ وہ تجھ واحد اور سچے خدا کو جانیں اور یسوع مسیح کو بھی جانیں، جیسے تو نے بھیجا ہے"۔(یوحنا، ۱۷: ۳)

تورات اور انجیل میں لفظ 'بیٹا' اور 'باپ' کی وضاحت

تورات اور انجیل میں بعض انبیاء کرام علیہم السلام یا دیگر افراد کو 'اللہ تعالیٰ کے بیٹے' قرار دیا گیا ہے اور اللہ عزوجل کو 'باپ' کہا گیا ہے۔مثلاً اسرائیل کو 'خدا کا بیٹا' کہا گیا ہے:

"تب فرعون سے کہنا کہ خداوند یوں فرماتا ہے کہ اسرائیل میرا پہلوٹھا بیٹا ہے اور میں نے تجھے کہا کہ میرے بیٹے کو جانے دے، تاکہ وہ میری

عبادت کر سکے، لیکن تو نے انکار کیا اور جانے نہ دیا۔ لٰہذا میں تیرے پہلوٹھے بیٹے کو مارڈالوں گا''۔ (خروج: ۴: ۲۲۔ ۲۳)

دوسری جگہ بنی اسرائیل کو'خدا کے فرزند' قرار دیا گیا ہے:

''تم خداوند اپنے خدا کے فرزند ہو، اس لیے مردوں کی خاطر اپنے آپ کو زخمی نہ کرنا اور نہ اپنے ابرو کے بال منڈواؤ۔ کیونکہ تم خداوند اپنے خدا کی مقدس قوم ہو اور خداوند نے تمہیں روئے زمین کی سب قوموں میں سے اپنی عزیز ترین قوم ہونے کے لیے چن لیا ہے''۔

(استثنائ: ۱۴: ۱۔ ۲)

اسی طرح انجیل میں سیدنا آدم علیہ السلام کو'خدا کا بیٹا' کہا گیا ہے:

''وہ انوس کا، وہ سیت کا اور وہ آدم کا اور وہ خدا کا بیٹا تھا''۔

(لوقا: ۳: ۳۸)

سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کو بھی کئی جگہوں پر'خدا کا بیٹا' کہا گیا ہے:

''باپ بیٹے سے محبت رکھتا ہے اور اس نے سب کچھ بیٹے کے حوالے کر دیا ہے اور جو بیٹے پر ایمان لاتا ہے، ہمیشہ کی زندگی پاتا ہے۔ لیکن جو بیٹے کو ردّ کرتا ہے، وہ زندگی سے محروم ہو کر خدا کے غضب میں مبتلا رہتا ہے''۔ (یوحنا: ۳: ۲۵۔ ۳۶)

جن لوگوں نے سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی اتباع اور پیروی کی ان کو بھی انجیل میں'خدا کے فرزند' قرار دیا گیا ہے:

''لیکن جتنوں نے اسے قبول کیا، خدا نے انہیں یہ حق بخشا کہ وہ خدا کے فرزند بنیں، یعنی انہیں جو اس کے نام پر ایمان لائے۔ (یوحنا: ۱: ۱۲)

صلح کرانے والے بھی'خدا کے بیٹے' ہیں:

''مبارک ہیں وہ جو صلح کراتے ہیں، کیوں کہ وہ خدا کے بیٹے کہلائیں گے''۔ (متی: ۵: ۹)

اسی طرح انجیل میں متعدد مقامات پر اللہ تعالیٰ کو'باپ' کہا گیا ہے:

''لیکن میں تم سے کہتا ہوں کہ اپنے دشمنوں سے محبت رکھواور جو تمہیں ستاتے ہیں ان کے لیے دعا کرو، تا کہ تم اپنے آسمانی باپ کے بیٹے بن سکو، جو اپنے سورج کو اچھے لوگوں پر چمکا تا ہے اور برے لوگوں پر بھی اور راست بازوں پر بھی مینہ برسا تا ہے اور ناراستوں پر بھی۔''
(متی:۵:۴۵)

تورات اور انجیل میں اگر لفظ 'بیٹا' اور 'باپ' کی صحت کو تسلیم کرلیا جائے تو اس سے مراد یہ ہرگز نہیں ہے کہ جنہیں 'اللہ کا بیٹا' کہا گیا ہے وہ نعوذ باللہ، اللہ کے بیٹے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کا باپ ہے، بلکہ یہ الفاظ گہرے تعلق اور شدید محبت کے اظہار کے لیے استعمال کیے گئے ہیں، کیوں کہ قدیم صحفِ سماوی میں کسی کے ساتھ گہرے تعلق اور محبت کو ظاہر کرنے کے لیے 'باپ' اور 'بیٹے' کی اصطلاحات استعمال کی جاتی ہیں، اس سے ہرگز حقیقی یا متبنّٰی بیٹا مراد نہیں لیا جاتا۔ اس اسلوب کی وضاحت سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے ایک قول سے ہوتی ہے۔ انھوں نے یہود کو مخاطب کرکے فرمایا تھا:

''تم اپنے باپ ابلیس سے کام کرتے ہو۔'' انہوں نے جواب میں اس سے کہا: ہم حرام سے پیدا نہیں ہوئے۔ ہمارا ایک باپ ہے، یعنی خدا۔ یسوع نے ان سے کہا: ''اگر خدا تمہارا باپ ہوتا تو تم مجھ سے محبت رکھتے۔ اس لیے کہ میں خدا سے نکلا ہوں اور آیا ہوں، کیوں کہ میں آپ سے نہیں آیا، بلکہ اسی نے مجھے بھیجا۔ تم میری باتیں کیوں نہیں سمجھتے؟ اس لیے کہ میرا کلام سن نہیں سکتے۔ تم اپنے باپ ابلیس سے ہو اور اپنے باپ کی خواہشوں کو پورا کرنا چاہتے ہو۔ وہ شروع سے ہی خونی ہے اور سچائی پر قائم نہیں رہا، کیوں کہ اس میں سچائی تو ہے ہی نہیں۔ جب وہ جھوٹ بولتا ہے تو اپنی ہی سی کہتا ہے، کیوں کہ وہ جھوٹا ہے، بلکہ جھوٹ کا باپ ہے۔'' (یوحنا،۸:۴۱۔۴۲)

اللہ تعالیٰ کی ذات واحد اور یکتا ہے۔ اس کی کوئی اولاد نہیں ہے۔ اس کی

طرف اولاد کو منسوب کرنا اس کی ذات میں شرک ہے ۔ یہود و نصاریٰ نے جو عقیدۂ ابنیت اختیار کیا ہے اس کی کوئی دلیل تورات اور انجیل میں نہیں ملتی ۔ قرآن مجید نے یہود و نصاریٰ کے عقیدۂ ابنیت کی صراحت کے ساتھ نفی کی ہے:

وَقَالَتِ الْيَهُودُ عُزَيْرٌ ابْنُ اللّٰهِ وَقَالَتْ النَّصٰرَى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ ذٰلِكَ قَوْلُهُم بِأَفْوَاهِهِمْ يُضَاهِؤُونَ قَوْلَ الَّذِيْنَ كَفَرُواْ مِن قَبْلُ قَاتَلَهُمُ اللّٰهُ أَنَّى يُؤْفَكُونَ۔ (التوبۃ:۳۰)

''یہودی کہتے ہیں کہ عُزیر اللہ کا بیٹا ہے اور عیسائی کہتے ہیں کہ مسیح اللہ کا بیٹا ہے ۔ یہ بے حقیقت باتیں ہوتی ہیں جو وہ اپنی زبانوں سے نکالتے ہیں، ان لوگوں کی دیکھا دیکھی جو ان سے پہلے کفر میں مبتلا ہوئے تھے ۔ خدا کی مار ان پر، یہ کہاں سے دھوکہ کھا رہے ہیں'' ۔

یہود و نصاریٰ نہ صرف انبیاء علیہم السلام کو اللہ کا بیٹا گردا ننے لگے، بلکہ ان کا شرک اس حد تک بڑھ گیا کہ وہ اپنے مذہب کے علماء اور درویشوں کو بھی اللہ کا درجہ دینے لگے ۔ قرآن مجید نے ان کے اس طرزِ عمل کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے:

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰـهًا وَّاحِدًا لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ سُبْحٰنَه عَمَّا يُشْرِكُوْنَ۔ (التوبۃ:۳۱)

''انہوں نے اپنے علماء اور درویشوں کو اللہ کے سوا اپنا ربّ بنالیا ہے اور اسی طرح مسیح اِبنِ مریم کو بھی، حالاں کہ ان کو ایک معبود کے سوا کسی کی بندگی کرنے کا حکم نہیں دیا گیا تھا، وہ جس کے سوا کوئی مستحق عبادت نہیں، پاک ہے وہ ان مشرکانہ باتوں سے جو یہ لوگ کرتے ہیں'' ۔

یہود و نصاریٰ میں شرک اس قدر سرایت کر گیا کہ وہ نہ صرف اپنے انبیاء کو اللہ کے بیٹے کہتے تھے، بلکہ وہ خود کو بھی اللہ کے بیٹے گردا ننے لگے :

وَقَالَتِ الْيَهُودُ وَالنَّصٰرى نَحْنُ أَبْنَاء اللّٰهِ وَأَحِبَّاؤُهُ قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُم بِذُنُوبِكُم بَلْ أَنتُم بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ يَغْفِرُ لِمَن يَشَاءُ وَيُعَذِّبُ مَن يَشَاءُ

وَلِلّٰہِ مُلۡکُ السَّمٰوٰتِ وَالۡأَرۡضِ وَمَا بَیۡنَھُمَا وَإِلَیۡہِ الۡمَصِیۡر۔(المائدۃ: ۱۸)

''یہود اور نصاریٰ کہتے ہیں کہ ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے چہیتے ہیں۔ ان سے پوچھو: پھر وہ تمہارے گناہوں پر تمہیں سزا کیوں دیتا ہے؟ درحقیقت تم بھی ویسے ہی انسان ہو جیسے اور انسان اللہ نے پیدا کیے ہیں۔ وہ جسے چاہتا ہے معاف کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے سزا دیتا ہے۔ زمین اور آسمان اور ان کی ساری موجودات اس کی مِلک ہیں اور اسی کی طرف سب کو جانا ہے''۔

قرآن مجید میں صراحت سے کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات میں یکتا ہے اس کا نہ کوئی بیٹا ہے، نہ کوئی باپ اور نہ کوئی اس کا ہم سر ہے:

قُلۡ ھُوَ اللّٰہُ أَحَدٌ۔ اللّٰہُ الصَّمَدُ۔ لَمۡ یَلِدۡ وَلَمۡ یُولَدۡ۔ وَلَمۡ یَکُن لَّہُ کُفُواً أَحَدٌ۔ (الاخلاص)

''آپ ان لوگوں سے کہہ دیجیے کہ وہ یعنی اللہ (اپنے کمالِ ذات اور صفات میں) ایک ہے۔ اللہ (ایسا) بے نیاز ہے (کہ وہ کسی کا محتاج نہیں اور اس کے سب محتاج ہیں) اس کے اولاد نہیں اور نہ وہ کسی کی اولاد ہے۔ اور نہ کوئی اس کے برابر کا ہے''۔

دوسری جگہ مزید وضاحت کی گئی ہے:

مَا اتَّخَذَ اللّٰہُ مِن وَلَدٍ وَمَا کَانَ مَعَہُ مِنۡ إِلَہٍ إِذاً لَّذَھَبَ کُلُّ إِلَہٍ بِمَا خَلَقَ وَلَعَلَا بَعۡضُھُمۡ عَلَی بَعۡضٍ سُبۡحَانَ اللّٰہِ عَمَّا یَصِفُونَ۔ (المؤمنون: ۹۱)

''اللہ نے کسی کو اپنی اولاد نہیں بنایا ہے اور کوئی دوسرا خدا اس کے ساتھ نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو ہر خدا اپنی خلق کو لے کر الگ ہو جاتا اور پھر وہ ایک دوسرے پر چڑھ دوڑتے۔ پاک ہے اللہ ان باتوں سے جو یہ لوگ بناتے ہیں''۔

توحیدِ الوہیت پر ہی تمام اعمال کی بنیاد ہے۔ اگر یہ درست نہ ہوگی تو تمام اعمال بے ثمر اور بے فائدہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

لَقَدْ کَفَرَ الَّذِیْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰہَ ثَالِثُ ثَلٰثَۃٍ وَمَا مِنْ اِلٰہٍ اِلَّآ اِلٰہٌ وَّاحِدٌ وَاِنْ لَّمْ یَنْتَھُوْا عَمَّا یَقُوْلُوْنَ لَیَمَسَّنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْھُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ۔(المائدۃ: ۷۳)

''یقیناً کفر کیا ان لوگوں نے جنہوں نے کہا کہ اللہ تین میں کا ایک ہے، حالاں کہ ایک خدا کے سوا کوئی خدا نہیں ہے۔ اگر یہ لوگ اپنی ان باتوں سے باز نہ آئے تو ان میں سے جس جس نے کفر کیا ہے اس کو درد ناک سزا دی جائے گی''۔

سورۃ الانبیاء میں اللہ تعالیٰ نے توحیدِ الوہیت کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا ہے:

لَوْ کَانَ فِیْھِمَا آلِھَۃٌ إِلَّا اللّٰہُ لَفَسَدَتَا فَسُبْحَانَ اللّٰہِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا یَصِفُونَ۔(الانبیائ:۲۲)

''اگر آسمان و زمین میں ایک اللہ کے سوا دوسرے خدا بھی ہوتے تو (زمین اور آسمان) دونوں کا نظام بگڑ جاتا۔ پس پاک ہے اللہ رب العرش ان باتوں سے جو یہ لوگ بنا رہے ہیں''۔

قرآن مجید میں انبیاء کی بعثت کا یہ مقصد بیان کیا گیا ہے:

وَمَا أَرْسَلْنَا مِن قَبْلِکَ مِن رَّسُولٍ إِلَّا نُوحِیْ إِلَیْہِ أَنَّہُ لَا إِلَہَ إِلَّا أَنَا فَاعْبُدُونِ۔ (الانبیائ:۲۵)

''ہم نے تم سے پہلے جو رسول بھی بھیجا ہے اس کو یہی وحی کی ہے کہ میرے سوا کوئی خدا نہیں ہے، پس تم لوگ میری ہی بندگی کرو''۔

اللہ کے اسماء و صفات میں تصورِ وحدانیت

یہودیت، عیسائیت اور اسلام، تینوں مذاہب میں اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات کے ساتھ کسی دوسری چیز کو تشبیہ دینا شرک قرار دیا گیا ہے اور شرک کو ایک بہت بڑا ناقابل معافی جرم بتایا گیا ہے۔ شرک کا ارتکاب کرنے والا اگر اس جرم سے باز نہیں آتا تو وہ اپنے اوپر سزا کو لازم کر لیتا ہے۔

تو رات میں توحید فی الاسماء والصفات کا بھرپور تذکرہ ملتا ہے :

''کیوں کہ خداوند تمہارا خدا، خداؤں کا خدا ہے اور خداوندوں کا خداوند ہے۔ وہ عظیم، قادر اور مہیب خدا ہے، جو کسی کی طرف داری نہیں کرتا اور نہ ہی رشوت لیتا ہے''۔ (استثنائ،۱۰: ۱۷)

صفات الٰہی کا مزید تذکرہ ان الفاظ میں کیا گیا ہے:

''اور خدا ابدالآباد خدا موسیٰ کے سامنے آیا اور فرمایا: خدا ابدالآباد خدا ہے، جو رحمن اور رحیم ہے، جو غضب کم اور معاف زیادہ کرنے والا ہے۔ ہزاروں کی بخشش اور معاف کرنے والا۔ بے انصافی بے راہ روی اور لوگوں کے گناہوں کو برداشت کرنے والا اور بے قصور کو قصوروار نہ ٹھہرانے والا''۔ (خروج، ۳۴: ۷-۶)

اللہ تعالیٰ کی صفات بے مثل ہیں، ان کو کسی بھی چیز کے مثل یا مشابہ سمجھنا یا خیال کرنا شرک ہے ۔سیدنا موسیٰ علیہ السلام سے کوہِ سینا پر اللہ تعالیٰ ہم کلام ہوا۔ اس موقع پر جو اس نے جو تعلیمات دیں ان کا تذکرہ تورات میں ان الفاظ میں کیا گیا ہے:

''اور خدا نے یہ باتیں کوہِ سینا پر (موسیٰ کو) کہیں: میں وہ ابدی خدا ہوں جو تمہیں ملکِ مصر میں غلامی سے چھٹکارا دلوا کر نکال لایا ہے۔ میرے مقابلے میں کسی اور کو خدا نہ بنانا۔ اپنے لیے کسی بھی ایسی چیز کی پوجا کے لیے شکل گھڑ کر نہ بنانا، چاہے وہ اوپر آسمانوں میں ہو یا زمین پر ہو یا زمین کے نیچے ہو یا پانی میں ہو۔تمھیں ان کو سجدہ نہیں کرنا اور نہ ہی ان کی عبادت کرنا ہے''۔ (خروج،۲۰ :۱-۵)

کتاب استثناء میں صفاتِ باری تعالیٰ کو کسی چیز کے ساتھ تشبیہ دینے کی بڑی سختی سے ممانعت کی گئی ہے :

''اور یہ بات اپنے دل و دماغ میں اچھی طرح سے رکھو کہ جب خدا ابدالآباد خدا نے حورب کے مقام پر تم سب سے آگ کے اندر سے بات کی تھی تو تم نے کوئی تشبیہ یا شکل وصورت نہیں دیکھی تھی۔ ایسا نہ کرنا کہ غلط راستہ اختیار کرلو اور بت گھڑ لو اور کسی نر یا مؤنث کی تشبیہ بنالو۔

کسی جانور کی شکل، جو زمین پر ہو یا کسی پرندے کی شکل، جو آسمان پر اڑتا ہو، یا کسی ایسی چیز کی تشبیہ، جو زمین پر رینگتی ہو، یا مچھلی کی تشبیہ، جو زمین کے نیچے پانی میں ہوتی ہے۔ اور ایسا نہ ہو کہ تم آسمان کی طرف نظر کرو اور سورج اور چاند اور ستارے اور بھی جو چیزیں آسمان میں ہیں دیکھو تو تمہارے دل ان کی طرف مائل ہو جائیں اور ان کی پوجا شروع کرو، جو کہ دراصل اللہ نے آسمان کی ان ساری چیزوں کو تمہاری خدمت میں لگا رکھا ہے''۔ (استثنائ:۴۰:۱۵۔۱۹)

یہودیت میں اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ کسی قسم کی تشبیہ دینے یا کسی اور کو اس کی ذات و صفات میں شامل کرنے سے اس قدر سختی سے منع کیا گیا ہے کہ وہ اشیاء یا افعال جن سے شرک کا شائبہ پیدا ہوسکتا تھا، ان سے بھی دور رہنے کی تعلیم دی ہے:

''تم اپنے لیے بت نہ بنانا اور نہ کوئی تراشی ہوئی صورت یا کوئی لاٹ اپنے لیے کھڑی کرنا اور نہ اپنے ملک میں کوئی شبیہ دار پتھر رکھنا کہ اسے سجدہ کرو، اس لیے کہ میں خداوند تمہارا خدا ہوں''۔ (احبار:۲۶:۱)

انجیل میں زور دے کر یہ بات کہی گئی ہے کہ عزت اور ذلت دینے والی ذات اللہ تعالیٰ ہی کی ہے۔ وہ جسے چاہے عزت عطا کر دے اور جسے چاہے ذلت دے دے:

''تم ایک دوسرے سے عزت پانا چاہتے ہو اور جو عزت خداوند کی طرف سے ملتی ہے اسے حاصل کرنا نہیں چاہتے۔ تم کیسے ایمان لاسکتے ہو؟''

(یوحنا:۵:۴۴)

قرآن کریم میں بھی توحیدِ صفات پر بہت زور دیا گیا ہے۔ اس کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو صفاتِ کمال اور صفاتِ جمال سے متصف مانا جائے اور اس سے کسی بھی دوسری چیز کو تشبیہ نہ دی جائے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

لَیسَ کَمِثْلِهٖ شَیءٌ وَهُوَ السَّمِیعُ البَصِیر (الشوریٰ:۱۱)

''کائنات کی کوئی چیز اس کے مشابہ نہیں۔ وہ سب کچھ سننے اور دیکھنے والا ہے''۔

دوسری جگہ ارشادِ باری ہے:

وَلِلّٰهِ الْاَسْمَاءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا وَذَرُوا الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْٓ اَسْمَائِهٖ سَيُجْزَوْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (الاعراف:۱۸۰)

''اللہ اچھے ناموں کا مستحق ہے، اس کو اچھے ہی ناموں سے پکارو اور ان لوگوں کو چھوڑ دو جو اس کے نام رکھنے میں راستی سے منحرف ہو جاتے ہیں۔ جو کچھ وہ کرتے رہے ہیں اس کا بدلہ وہ پا کر رہیں گے۔

شرک کی ممانعت

اللہ تعالیٰ کی ذات، صفات اور عبادات میں شرک کرنا اس کے ہاں سب سے بڑا جرم ہے۔ شرک اعمال کو فاسد اور تباہ و برباد کر دیتا ہے اور اس کا مرتکب دوزخ کا مستحق ٹھہرتا ہے۔

تورات میں ہے کہ جو شخص اللہ کی ذات، صفات اور عبادت میں شرک کا ارتکاب کرتا ہے، اس کی سزا بارگاہِ الٰہی میں بہت سخت ہے:

''میرے حضور تو غیر معبودوں کو نہ ماننا۔ تو کسی بھی شے کی صورت پر، خواہ وہ اوپر آسمان میں یا نیچے زمین پر یا نیچے پانیوں میں ہو، کوئی بت نہ بنانا۔ تو ان کے آگے سجدہ نہ کرنا اور نہ ہی تو ان کی عبادت کرنا۔ کیوں کہ میں خداوند تیرا غیور خدا ہوں۔ اور جو مجھ سے عداوت رکھتے ہیں میں ان کی اولاد کو تیسری اور چوتھی پشت تک ان کے باپ دادا کی بدکاری کی سزا دیتا ہوں، لیکن ہزاروں لوگ، جو مجھ سے محبت رکھتے ہیں اور میرے حکموں کو مانتے ہیں، میں ان سے پشت در پشت محبت رکھتا ہوں''۔ (خروج: ۲۰:۳۔۶)

اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی کے نام کی قربانی جائز نہیں ہے:

''اور جو بھی اللہ تعالیٰ کے نام کے سوا کسی دوسرے خدا کے نام قربانی کرے، اسے موت کے گھاٹ اتار دو''۔ (خروج، ۲۲:۱۹)

شرک کو انجیل میں بھی سب سے بڑا جرم قرار دیا گیا ہے اور اسے نا قابل معافی کہا گیا ہے:

''اس لیے میں تم سے کہتا ہوں کہ آدمیوں کا ہر گناہ اور کفر تو معاف کیا جائے گا، مگر جو کفر روح کے حق میں ہو وہ معاف نہ کیا جائے گا۔ اگر جو کوئی ابن آدم کے برخلاف کچھ کہتا ہے تو اسے معاف کر دیا جائے گا، لیکن جو پاک روح کے خلاف کچھ کہے گا اسے نہ تو اس دنیا میں معاف کیا جائے گا نہ آنے والی دنیا میں''۔ (متی، ۱۲: ۳۰۔ ۳۲)

قرآن کریم میں بھی شرک کی بہت سخت الفاظ میں مذمت کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

لَاتُشْرِکْ بِاللّٰہِ إِنَّ الشِّرْکَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ (لقمان: ۱۳)

''اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کر، حق یہ ہے کہ شرک بہت بڑا ظلم ہے''۔

شرک کو اسلام میں اتنا بڑا جرم قرار دیا گیا ہے کہ اس کی وجہ سے انسان کے تمام نیک اعمال ضائع ہو جاتے ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَ لَقَدْ أُوحِیَ إِلَیْکَ وَإِلَی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکَ لَئِنْ أَشْرَکْتَ لَیَحْبَطَنَّ عَمَلُکَ وَ لَتَکُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِیْنَ (الزمر: ۶۵)

''(یہ بات تمھیں ان سے صاف کہہ دینی چاہیے، کیوں کہ) تمہاری طرف اور تم سے پہلے گزرے ہوئے تمام انبیاء کی طرف یہ وحی بھیجی جا چکی ہے کہ اگر تم نے شرک کیا تو تمہارا عمل ضائع ہو جائے گا اور تم خسارے میں رہو گے''۔

انسان کے تمام گناہ معاف کیے جا سکتے ہیں، لیکن شرک کسی صورت میں قابل معافی نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

إِنَّ اللّٰہَ لاَ یَغْفِرُ أَن یُشْرَکَ بِہِ وَیَغْفِرُ مَا دُونَ ذٰلِکَ لِمَن یَشَاءُ وَمَن یُشْرِکْ بِاللّٰہِ فَقَدِ افْتَرَی إِثْماً عَظِیْماً (النسائ: ۴۸)

''اللہ بس شرک ہی کو معاف نہیں کرتا، اس کے ماسوا دوسرے جس قدر گناہ ہیں وہ جس کے لیے چاہتا ہے معاف کر دیتا ہے۔ اللہ کے ساتھ جس نے کسی اور کو شریک ٹھیرایا اس نے تو بہت ہی بڑا جھوٹ تصنیف

کیا اور بڑے سخت گناہ کی بات کی۔‘‘

مشرک پر جنت حرام کر دی گئی ہے اور اسے دائمی جہنمی قرار دیا گیا ہے:

اِنَّہٗ مَنۡ یُّشۡرِکۡ بِاللّٰہِ فَقَدۡ حَرَّمَ اللّٰہُ عَلَیۡہِ الۡجَنَّۃَ وَمَاۡوٰىہُ النَّارُ ؕ وَمَا لِلظّٰلِمِیۡنَ مِنۡ اَنۡصَارٍ (المائدۃ: ۷۲)

’’جس نے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھیرایا اس پر اللہ نے جنّت حرام کر دی ہے اور اس کا ٹھکانا جہنّم ہے اور ایسے ظالموں کا کوئی مددگار نہیں‘‘۔

اس تفصیل سے واضح ہے کہ تمام الہامی مذاہب توحید کے زبردست حامی ہیں اور یہی تمام انبیاء کرام کی وعظ ونصیحت اور اصلاح وتبلیغ کا بنیادی نکتہ اور مرکزی پیغام تھا۔ قرآن مجید میں اس کی صراحت ان الفاظ میں کی گئی ہے:

وَلَقَدۡ بَعَثۡنَا فِیۡ کُلِّ اُمَّۃٍ رَّسُوۡلًا اَنِ اعۡبُدُوا اللّٰہَ وَاجۡتَنِبُوا الطَّاغُوۡتَ ۚ فَمِنۡہُمۡ مَّنۡ ہَدَی اللّٰہُ وَمِنۡہُمۡ مَّنۡ حَقَّتۡ عَلَیۡہِ الضَّلٰلَۃُ ؕ فَسِیۡرُوۡا فِی الۡاَرۡضِ فَانۡظُرُوۡا کَیۡفَ کَانَ عَاقِبَۃُ الۡمُکَذِّبِیۡنَ (النحل: ۳۶)

’’ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیج دیا اور اس کے ذریعہ سے سب کو خبردار کر دیا کہ اللہ کی بندگی کرو اور طاغوت کی بندگی سے بچو۔ اس کے بعد ان میں سے کسی کو اللہ نے ہدایت بخشی اور کسی پر ضلالت مسلط ہو گئی۔ پھر ذرا زمین میں چل پھر کر دیکھ لو کہ جھٹلانے والوں کا کیا انجام ہو چکا ہے‘‘۔

موجودہ تورات اور انجیل کو مکمل طور پر الہامی نہیں قرار دیا جا سکتا، لیکن تحریفات کے باوجود ان کتب میں عقیدۂ توحید کو دبایا نہیں جا سکا۔ ان میں قرآن مجید کی طرح جابجا توحید پر زور دیا گیا ہے اور ہر قسم کی یکتائی صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ثابت کی گئی ہے۔ یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ تورات اور انجیل کے حاملین کی اکثریت نے عقیدۂ توحید سے انحراف کیا اور کفر وشرک میں مبتلا ہو گئے۔ اس کے ساتھ یہ بھی المیہ ہے کہ امت محمدیہ میں سے بھی بعض افراد شرک کا ارتکاب کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس سے محفوظ رکھے۔ آمین

مسلم دورِ حکومت کے علماء وصوفیہ اور دعوتِ دین

______ ڈاکٹر محمد شمیم اختر قاسمی

مسلم حکم رانوں کے اچھے نظم ونسق، رعایا پروری نیز دینی و مذہبی محاسن کی وجہ سے ہی ہندوستان میں اسلام پھیلا۔ یہ سلاطین جہاں بھی فتوحات کے لیے جاتے، مسلمانوں کی بڑی تعداد ان کے ساتھ ہوتی تھی۔ بہت سے لوگ ملک فتح کرنے کے بعد اپنے مقام کو لوٹ آتے تھے، لیکن ان میں ایسے بھی افراد ہوتے جو وہیں رک جاتے تھے۔ یہ لوگ چوں کہ شان دار اسلامی تہذیب کے حامل ہوتے تھے، اس لیے مقامی باشندوں کا ان سے میل جول کی بنا پر متاثر ہونا ایک فطری امر تھا اور یہ لوگ خود بھی یہی چاہتے تھے کہ ان کو اسلامی تعلیمات و اقدار سے روشناس کرایا جائے۔ شمالی ہندوستان میں مسلمان بہ تدریج آئے اور یہاں مقیم ہوئے۔ سلاطین اور مسلم افواج سے جڑے علماء ومشائخ اور صوفیہ کرام کی بھی جماعت ہوتی تھی، جنھیں ذمہ داری دی جاتی تھی کہ وہ نہ صرف مسلمانوں کی تعلیم وتربیت کی فکر کریں، بلکہ مقامی باشندوں کو بھی اپنے فیضان سے محروم نہ کریں۔ اگر یہ سلاطین نہ آتے تو کیسے ممکن تھا کہ علماء وصوفیہ یہاں دین کی دعوت عام کرتے اور اسلامی تعلیمات کو پھیلاتے۔ سید صباح الدین عبدالرحمن لکھتے ہیں:

> ''مسلمان بادشاہوں کی بدولت ہندوستان میں علماء اور صوفیہ کو قدم جمانے کا، اسلامی تعلیمات کو فروغ دینے کا موقع ملا اور ہر دور میں بہ کثرت علماء پیدا ہوتے رہے۔ سلاطینِ دہلی کے ابتدائی دور میں علماء زیادہ تر نیسا پور، صغان، غزنین، کاشان، بلخ، سجستان، خوارزم اور تبریز سے آئے، جیسا کہ ان کے ناموں سے ظاہر ہے۔''[۱]

ہندوستان کے علماء ومشائخ اور فقہاء ومحدثین کی خدماتِ جلیلہ کی طویل

تاریخ ہے اوران کی تعداد بھی بہت ہے۔ ان میں سے بعض علمائے عظام اور بزرگانِ دین کی مساعی جمیلہ کا ذکر سطور ذیل میں بالاختصار کیا جارہا ہے۔

شیخ ابوترابؒ

جن دنوں سندھ میں عربوں کی حکومت تھی، ایک بزرگ اور صوفی تبع تابعی شیخ ابوترابؒ کے وارد ہونے اور وہاں قیام کرنے کا پتہ چلتا ہے۔ انہوں نے اپنے وعظ وارشاد سے بہت سے غیر مسلموں کو حلقۂ اسلام میں داخل کیا۔ شیخ محمد اکرام نے لکھا ہے کہ وہ عباسی خلفاء کے عہدِ حکومت میں آئے اور کئی علاقوں پر قابض ہوگئے تھے۔ ان کا مزار زیارت گاہ خاص وعام ہے اوراس کے گنبد پر ۱۷۱ھ/ ۷۸۸ء درج ہے۔ ۲؎

داتا گنج بخش لاہوریؒ

شیخ علی بن عثمان ہجویری (۴۰۰ھ/۱۰۰۹–۴۶۵ھ/ ۱۰۷۲ئ) بہ ملقب داتا گنج بخش لاہوری، غزنی سے چلے اور مختلف اسلامی دیارو امصار کی سیاحت کے بعد سلطان مسعود بن محمود کے آخری عہد میں لاہور میں وارد ہوئے۔ امیر حسن سنجری نے خواجہ نظام الدین اولیا کے حوالے سے آپ کے ہندوستان آنے کا دل چسپ واقعہ بیان کیا ہے:

> ''شیخ حسین زنجانی اور شیخ علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہما دونوں ایک ہی پیر کے مرید ہوئے اور وہ پیر اپنے عہد کے قطب تھے۔ شیخ حسین زنجانی ایک زمانے میں لاہور میں رہتے تھے۔ کچھ عرصے کے بعد ان کے پیر نے خواجہ علی ہجویری کو حکم دیا کہ لاہور جاؤ اور وہاں رہو۔ شیخ علی ہجویری نے عرض داشت کی کہ وہاں حسین زنجانی موجود ہیں۔ پیر نے فرمایا: تم جاؤ۔ جب علی ہجویری ان کے اشارے کے موافق لاہور میں پہنچے تو رات تھی۔ دوسری صبح شیخ حسین زنجانی کا جنازہ باہر لایا گیا۔'' ۲؎

شیخ ہجویری کے ہاتھ پر بہت سے لوگ اسلام لائے، جن میں سے رائے راجو، جو سلطان مودود بن مسعود غزنوی کی طرف سے لاہور کا نائب تھا، خاص طور پر قابل

ذکر ہے۔مسلمان بنانے کے بعد اس کا نام شیخ ہندوی رکھا گیا۔ ۳؎ آپ ایک اچھے استاد ہونے کے ساتھ بڑے پایہ کے مصنف بھی تھے، شعر و شاعری کا بھی اچھا ذوق تھا۔متعدد کتابیں تصنیف کیں، مگر سوائے کشف المحجوب کے کسی کتاب کا پتہ نہیں چلتا۔ یہ تصوف کی پہلی کتاب تصور کی جاتی ہے ۔اس میں تصوف کے طریقے کی تحقیق ،اہلِ تصوف کے مقامات کی کیفیت ،ان کے اقوال اور صوفیانہ فرقوں کا بیان ہے ۔دارا شکوہ نے اس کی اہمیت کے بارے میں لکھا ہے کہ ''یہ تصنیف درحقیقت کامل رہ نما ہے، کتبِ تصوف میں ایک مرشد کامل ہے، فارسی زبان میں ایسی کتاب تصنیف نہیں ہوئی ۔'' ۴؎

شیخ عزیز الدین مکیؒ

شیخ عزیز الدین مکی بغداد کے رہنے والے تھے ۔ بارہ سال مکہ معظّمہ میں مقیم رہے، اس لیے پیر مکی کے نام سے مشہور ہوئے ۔ ۵۷۴ھ/ ۱۱۷۸ء میں لاہور تشریف لائے۔ اس وقت وہاں غزنوی خاندان کی حکومت تھی ،لیکن سلطان محمد غوری پنجاب میں داخل ہو چکا تھا ۔ لاہور کے غزنوی حاکم خسرو ملک نے آپ سے دعا کی درخواست کی ۔آپ نے فرمایا کہ ابھی چند سال تمھیں امان ہے، اس کے بعد لاہور میں غوری کی حکومت ہو جائے گی ۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور چھ سال بعد لاہور پر شہاب الدین کی حکومت قائم ہوگئی ۔شیخ عزیز الدین ۳۶ رسال تک مصروفِ ہدایت رہے اور بڑی خلقت آپ سے فیض یاب ہوئی ۔ ۶۱۲ھ/ ۱۲۱۵ء میں آپ کی وفات ہوئی ۔ ۵؎

سلطان سخی سرورؒ

سید احمد مشہور بہ سلطان سخی سرور ملتان کے موضع کرسی کوٹ میں پیدا ہوئے ۔ ابتدائی تعلیم و تربیت کے بعد مولوی اسحق لاہوری سے علومِ ظاہری کی تکمیل کی ۔تصوف میں اپنے والد کے علاوہ شیخ شہاب الدین سہروردی سے بھی اکتسابِ فیض کیا۔ پھر لاہور کے موضع سودھرہ میں اقامت اختیار کی اور یادِ الٰہی و خلقِ خدا میں مشغول ہو گئے ۔آپ کو اس راہ میں اتنی مقبولیت حاصل ہوئی کہ ہر وقت خانقاہ میں جم غفیر لگا رہتا تھا اور حصولِ مراد کے بعد ہی بھیڑ ختم ہوتی تھی ۔آپ مقام دھونکل میں بھی کئی

سال رہے، بعد میں اپنے وطن کے قریب ضلع ڈیرہ غازی خاں کے ایک گاؤں شاہ کورٹ میں سکونت پذیر ہوے۔ آپ کی مقبولیت کو دیکھ کر حاکمِ ملتان نے اپنی بیٹی بیاہ دی، مگر وہ حاسدوں کے حسد سے نہ بچ سکے، یہاں تک کہ ۵۷۷ھ/ ۱۱۸۱ء میں انھیں شہید کر دیا گیا۔ مزار شاہ کوٹ کے قریب ہے۔[۶]

شیخ اسمٰعیل لاہوریؒ

شیخ اسمٰعیل لاہوری (م ۴۴۸ھ/۱۰۵۶ئ) ظاہری و باطنی علوم کے جامع تھے۔ سادات بخارا سے چل کر لاہور میں مقیم ہوئے اور وعظ وارشاد کی محفل گرم کی۔ آپ کی مجلسِ وعظ میں خلقِ خدا کثرت سے شرکت کرتی تھی۔ ان میں ہندو بھی ہوتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ آپ نے لاہور کی جامع مسجد میں پہلا جمعہ ادا کیا۔ پہلے ہفتہ میں تقریباً ڈھائی سو افراد نے اسلام قبول کیا۔ دوسرے جمعہ میں پانچ سو اور تیسرے جمعہ میں ایک ہزار۔[۷] محمد اسحاق بھٹی لکھتے ہیں:

> ''شیخ اسماعیل حدیث وتفسیر کے متبحر عالم تھے اور ان کو یہ امتیاز بھی حاصل ہے کہ شہر لاہور میں اسلام کی تبلیغ کرنے والے پہلے مبلغ تھے۔ ان کا وعظ سننے کے لیے لوگ کثیر تعداد میں جمع ہوجاتے تھے اور اسلام قبول کرنے والوں کی تعداد روز بروز بہت تیزی سے بڑھ رہی تھی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ایسا کوئی غیر مسلم نہ تھا جس نے شیخ اسماعیل سے ذاتی قرب حاصل ہونے کے بعد اسلام قبول نہ کیا ہو۔''[۸]

امام حسن صغانی لاہوریؒ

امام حسن صغانی کے آباء واجداد ماوراء النہر سے ہجرت کر کے ہندوستان آئے اور خطۂ لاہور میں مقیم ہوگئے۔ یہیں ان کی پیدائش ۵۷۷ھ/۱۱۸۱ء میں ہوئی۔ انھوں نے مختلف اسلامی ملکوں میں پہنچ کر تعلیم حاصل کی اور ماہرینِ فن علماء سے اکتسابِ فیض کیا اور لغت وحدیث کے امام کہلائے۔ انہوں نے 'مشارق الانوار' کے نام سے حدیث کی ضخیم کتاب لکھی۔ اس خدمت پر عباسی خلیفہ مستنصر باللہ نے

خلعت وانعام سے نوازا۔ آپ نے اپنا زیادہ تر وقت مکہ معظّمہ اور بغداد میں گزارا ۔کچھ دن ہندوستان میں بھی رہے۔ ٦٥٠ھ/ ١٢٥٢ء میں آپ کی وفات ہوئی ۔ پوری زندگی تعلیم وتدریس اور تصنیف وتالیف میں گزاری۔ کتابِ مذکور کے علاوہ کئی اہم کتابیں مختلف موضوعات پر تحریر کیں، جن کی تعداد نو(٩) ہے۔ رحمان علی نے اپنی کتاب تذکرہ علمائے ہند میں ان کی تفصیل بیان کی ہے۔٩؎ سید صباح الدین عبد الرحمان نے مزید اور کتابیں ان سے منسوب کی ہیں ۔ان تمام کتابوں میں 'مشارق الانوار' کو جومقبولیت حاصل ہوئی وہ ان کی دوسری تصانیف کو حاصل نہ ہوسکی ۔ ہند وبیرون ہند میں اس کتاب کا خوب چرچا رہا ۔کافی عرصے تک ہندوستان میں علم حدیث میں صرف یہی کتاب رائج رہی اور عالم اسلام کے ممتاز علماء نے اس کی شروح اورحواشی تحریر کیے۔١٠؎ سید سلیمان ندوی کے بقول ''مصنف صغانی نے ہندوستان میں علم حدیث کی روشنی پھیلائی، تاہم یہ روشنی گھر میں کم اور گھر سے باہر زیادہ پھیلی''۔١١؎ آپ کے دامنِ تربیت سے معروف شخصیتیں فیض یاب ہوئیں،جن کے اسماء گرامی مولانا عبدالحی حسنی نے اپنی کتاب 'نزھۃالخواطر' میں بیان کیے ہیں۔ ١٢؎

خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ

خواجہ معین الدین چشتی اجمیری سنجری کی پیدائش سجستان میں ٥٣٧ھ / ١١٤٢ء میں ہوئی۔تعلیم کے لیے وطن سے نکل کر دوسرے اسلامی ملکوں میں پہنچے۔ آخر میں ہرون نیشاپور میں خواجہ عثمان ہرونی چشتی سے وابستہ ہوئے۔مجاہدۂ شاقہ کے بعد ان سے خرقۂ خلافت حاصل کیا، پھر مختلف شہروں سے گزرتے ہوئے ہندوستان آئے ۔لاہور، ملتان میں کچھ مدت گزارنے کے بعد دہلی آگئے، یہاں سے کوچ کیا تو اجمیر آکر ٹھہرے اور یہیں مستقل طور پر رشد وہدایت کا چراغ روشن کرنے لگے۔ ہزاروں بندگانِ خدا نے آپ سے فیض حاصل کیا اور بہت سے ہندوؤں نے آپ کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا۔ پروفیسر آرنلڈ نے لکھا ہے کہ دہلی سے اجمیر جاتے ہوئے انہوں نے سات سو افراد کو مسلمان کیا۔ ١٢؎ جب کہ ملا بدایونی نے اس تعداد کے

تعین میں احتیاط سے کام لیا ہے۔ ۱۴؎ ابوالفضل نے بھی بس اتنا لکھا ہے کہ کثیر تعداد میں لوگوں نے اسلام قبول کیا۔ ۱۵؎ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی لکھتے ہیں:

> ’’سلسلۂ چشتیہ کی بنیاد ہندوستان میں پہلے ہی دن سے اشاعتِ اسلام و تبلیغ پر تھی اور اس کے عالی مرتبت بانی حضرت خواجہ معین الدین چشتی کے ہاتھ پر اس کثرت سے لوگ مسلمان ہوئے کہ تاریخ کے اس اندھیرے میں ان کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی تعداد کی یہ کثرت بہت کچھ حضرت خواجہ کی کوششوں اور روحانیت کی رہین منت ہے۔‘‘ ۱۶؎

نوے (۹۰) سال کی عمر پا کر ۶۲۷ھ/ ۱۲۳۰ء میں آپ نے وفات پائی۔مزار اجمیر میں ہے، جو آج بھی مرجع خلائق ہے۔

خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ

خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کا زمانہ چھٹی صدی ہجری کا ہے۔ تاریخِ ولادت کا پتہ نہیں چلتا۔جب آپ ڈیڑھ سال کے تھے تو والد کا انتقال ہوگیا۔والدہ نے تعلیم وتربیت کی۔بیس سال کی عمر میں خواجہ معین الدین چشتی اجمیری کی خدمت میں پہنچے اور ان سے وابستہ ہوگئے۔جب خواجہ اجمیری ہندوستان آگئے تو ان کی جدائی کا غم انھیں اتنا ستایا کہ وہ خود بھی بغداد چھوڑ کر یہاں چلے آئے۔حضرت اجمیری نے آپ کو دہلی میں قیام کرنے اور خلقِ خدا کو فیض پہنچانے کا حکم دیا۔

آپ نے پوری زندگی خلقِ خدا کی تعلیم وتربیت میں بسر کی۔یہی وجہ ہے کہ مختصر مدت میں آپ کے ذریعہ بہت سے خلفاء تیار ہوئے۔ ۶۳۳ھ/ ۱۲۳۶ء میں آپ کا انتقال ہوگیا۔شیخ نے ہندوستان میں تعلیم وتربیت اور تزکیۂ نفس کے حوالے سے جو اہم خدمت انجام دی ہے،اس پر روشنی ڈالتے ہوئے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی لکھتے ہیں:

> ’’دہلی نہ صرف ہندوستان کا دارالحکومت ، بلکہ عالم اسلام کی نئی طاقت اور دعوت وتجدید اسلام کا نیا مرکز تھا اور جہاں عالم اسلام کے ممتاز ترین علماء واساتذہ، سادات وشرفاء اور مشائخ واہل سلسلہ اور دنیائے اسلام

کے بہترین دل ودماغ جمع تھے۔اشاعتِ طریق وتربیتِ قلوب اورنئی ابھرتی ہوئی اسلامی سلطنت کی رہ نمائی کا کام اپنے دامنِ فقر واستغنا کو ذرہ برابر آلود اور ترک کیے بغیر انجام دینا بڑا نازک اور مشکل تھا۔اس کے لیے پہاڑ کی سی استقامت اور ہوا کی سی سبک روی اور سبک گامی کی ضرورت تھی، جس سے کسی شیشے کو ٹھیس نہ لگے۔خواجہ صاحب نے بڑی کام یابی اورخوش اسلوبی کے ساتھ اس نازک اور دشوار کام کو انجام دیا۔ان کو اس خدمت کے لیے طویل زمانہ نہیں ملا، اپنے شیخ کے بعد تو مشکل سے چار پانچ سال اور زندہ رہے لیکن ان کی ذات سے ہندوستان میں نہ صرف سلسلۂ چشتیہ کی بنیاد پڑ گئی، بلکہ جن مقاصدِ عالیہ کے لیے حضرت خواجہ معین الدین نے ہندوستان کو اپنے قیام اور کام کے لیے انتخاب کیا تھا وہ صدیوں کے لیے محفوظ ہو گیا۔''۱۷؎

خواجہ فرید الدین گنج شکرؒ

خواجہ فرید الدین گنج شکر ۵۶۹ھ/ ۱۱۷۴ء میں ملتان کے ایک قصبہ کھتوال میں پیدا ہوے۔تعلیم سے فراغت کے بعد اٹھارہ (۱۸) سال کی عمر میں خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کی خدمت میں حاضر ہوکر بیعت کا شرف حاصل کیا۔حضرت بختیار کاکی نے ان کی اقامت کے لیے غزنین دروازہ کے پاس ایک جگہ کا انتخاب کیا، جہاں وہ ریاضت ومجاہدہ میں مشغول ہوگئے۔شیخ کی تعلیمات وارشادات سے نہ صرف مسلمانوں نے فیض حاصل کیا، بلکہ غیر مسلموں کی بڑی تعداد بھی مشرف بہ اسلام ہوئی ۔کہاجاتا ہے کہ پاک پٹن کے اطراف میں زیادہ تر جو نومسلم ہیں وہ حضرت خواجہ ہی کی برکت سے مسلمان ہوئے ۔ پنجاب کے بہت سے افراد کا بھی حضرت کے ہاتھوں اسلام قبول کرنے کا ذکر ملتا ہے ۔۱۸؎

آپ کا انتقال ۶۶۴ھ/ ۱۲۶۵ء میں ہوا۔اجودھن میں مزار مبارک ہے ۔

خواجہ نظام الدین اولیاءؒ

خواجہ نظام الدین اولیاء ۶۳۶ھ/ ۱۲۳۹ء میں ضلع بدایوں میں پیدا ہوے

۔ پانچ سال کی عمر میں یتیم ہوگئے تھے۔ والدہ کی شفقت ومحبت میں پلے بڑھے اور تعلیم و تربیت سے آراستہ ہوے ۔تعلیم کی تکمیل دہلی پہنچ کر وہاں کے علمائے کبار سے کی۔ بعد میں خواجہ فریدالدین کی خدمت میں اجودھن پہنچے اور ان سے بیعت کی۔ اس وقت آپ کی عمر بیس سال کی تھی۔

آپ کی خانقاہ سے علم ومعارف کے چشمے ابلتے تو اس کا فیض عوام وخواص، ادنیٰ واعلیٰ ہر ایک کو پہنچتا تھا۔آپ کی محفل میں غیر مسلم بھی شرکت کرتے تھے، بلکہ ان میں سے بعض نے آپ کے ہاتھ پر اسلام بھی قبول کیا۔۱۹؎

آپ کا انتقال ماہ ربیع الاول جمعہ کے دن ۷۲۵ھ/ ۱۳۲۵ء میں ہوا۔آپ کے ملفوظات کو حسن سجزی نے جمع کیا ہے، جو علمی دنیا میں بہت مقبول ہے۔

شیخ نصیرالدین چراغ دہلویؒ

شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی (م ۷۵۷ھ/ ۱۳۵۶ئ) شیخ نظام الدین اولیاء کے مرید اور خلیفہ تھے۔ وہ اپنے خلفاء کو اس بات کی تلقین کرتے تھے کہ علوم دین کی اشاعت اور شریعتِ اسلامی کی ترویج میں مصروف رہیں۔ انھوں نے اپنے بھانجے اور خلیفۂ اعظم خواجہ کمال الدینؒ کو احمد آباد بھیجا، جہاں ان کی اولاد واحفاد نے سلسلۂ تبلیغ جاری رکھا۔ چنانچہ خواجہ کمال الدین کے صاحب زادے شیخ سراج الدین کا مزار گجرات کے پرانے پایۂ تخت پٹن میں موجود ہے۔اسی طرح انھوں نے مولانا خواجگی اور شیخ احمد تھانیسری کو کالپی میں خلیفہ بنا کر بھیجا۔ وہیں ان دونوں بزگوں کے مزار ہیں۔ دکن میں آپ کے نام ور خلیفہ حضرت گیسو درازؒ ہیں۔ پونا اور ہلگام کے بہت سے لوگوں نے آپ کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا۔ ۲۰؎ آپ نے نہ صرف اصلاح وتربیت اور ارشاد وہدایت کے ذریعے تسخیرِ قلوب کا کام بڑے پیمانے پر انجام دیا، بلکہ علومِ اسلامیہ کی نشر واشاعت کی بھی خدمت انجام دی۔ کلام، تصوف اور تفسیر میں ایک سو سے زیادہ کتابیں تحریر کیں۔آپ کے ملفوظات وارشادات کا مجموعہ 'خیر المجالس' کے نام سے مرتب کیا گیا ہے۔

شیخ جلال الدین تبریزیؒ

خطۂ بنگال کو سب سے پہلے جس بزرگ ہستی نے اپنے قدمِ مبارک سے رونق بخشی وہ شیخ جلال الدین تبریزی ہیں۔آپ شیخ شہاب الدین سہروردی کے مرید اور خواجہ بہاء الدین زکریا ملتانی کے خواجہ تاش تھے۔شیخ اپنے پیر بھائی سے ملنے کے لیے ملتان آئے، کچھ مدت یہاں گزارنے کے بعد دہلی تشریف لائے اور خواجہ قطب الدین کاکی سے خلافت حاصل کی۔ پھر بدایوں ہوتے ہوئے بنگال پہنچے۔ یہاں آپ نے تبلیغ وارشاد کا کام نہایت کام یابی سے انجام دیا،جس کے نتیجہ میں بڑی تعداد میں لوگوں نے اسلام قبول کیا۔آپ کا انتقال ۶۲۲ھ/ ۱۲۲۵ء میں ہوا۔سلہٹ میں مزار ہے۔ پھر سلطان المشائخ نے سراج الدین بدایونی کو خلیفہ بنا کر بنگال روانہ کیا۔ان کے مرید شیخ علاء الدین علاء الحق ، پھر ان کے مرید میر اشرف جہاں گیری تھے۔ان بزرگوں کے صدہا مریدوں نے بنگال میں اسلام پھیلایا۔۲۱؎ ان کی تبلیغی مساعی کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں :

> ''ان بزرگوں کے لیے، جن میں مفلس ماہی گیر، شکاری قزاق اور ادنیٰ قوم کے کاشت کار تھے،اسلام ایک اوتار تھا،جو ان کے لیے آکاش سے اترا تھا۔ وہ حکم راں قوم کا مذہب تھا، اس کے پھیلانے والے باخدا لوگ تھے، جنہوں نے توحید ومساوات کا مژدہ ایسی قوم کو سنایا جن کو سب ذلیل وخوار سمجھتے تھے۔اس کی تعلیم نے خدا اور اسلامی اخوت کا بلند ترین تخیل پیدا کر دیا اور بنگال کی کثرت سے بڑھنے والی قوموں کو، جو صدیوں سے ہندوؤں کے طبقے سے تقریباً خارج ہو کر بڑی ذلت و خواری کے دن کاٹ رہی تھیں،اسلام نے بلا تامل اپنی اخوت کے دائرے میں شامل کرلیا۔''۲۲؎

شیخ شرف الدین یحییٰ مَنیریؒ

شیخ شرف الدین یحییٰ منیری پٹنہ، بہار سے متصل بستی منیر کے ایک علمی

گھرانے میں ۲۹ رشعبان ۶۶۱ھ/ ۱۲۶۳ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں میں حاصل کی۔ پھر سنار گاؤں (بنگالہ) پہنچ کر علوم ظاہری کی تکمیل کی۔اس کے بعد دہلی تشریف لے گئے اور وہاں مختلف اولیائے کبار کے آستانوں پر حاضری دی۔ یہاں تک کہ آخر میں شیخ نجیب الدین فردوسی کی خدمت میں پہنچے اور ان سے بیعت ہوگئے۔ کچھ عرصہ کے بعد اجازت وخلافت حاصل کر کے اپنے وطن لوٹے اور ایک مدت تک صحرانوردی اختیار کی۔ بعد میں عقیدت مندوں کے اصرار پر جنگل سے نکل کر آبادی میں قیام فرمایا اور خلقِ خدا کی ہدایت ورہنمائی فرمانے لگے۔ ۲۳؎ آپ کی وفات شوال ۷۸۲ھ/ ۱۳۸۰ء میں ہوئی۔

آپ نے نصف صدی سے زائد عرصہ خلق خدا کی ہدایت وارشاد اور طالبین کی تعلیم وتربیت میں گزارا۔ اس عرصہ میں ایک لاکھ سے زائد افراد آپ کے حلقۂ ارادت میں شامل ہوئے۔ متعدد ہندو فقیروں اور جوگیوں کے قبولِ اسلام کے واقعات نقل کیے گئے ہیں۔ ۲۴؎ آپ کثیر التصانیف بزرگوں میں سے ہیں۔آپ کے مکتوبات کو بڑی اہمیت اور شہرت حاصل ہے۔آپ کی خدماتِ جلیلہ کا تذکرہ کرتے ہوئے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رقم طراز ہیں:

> ''حضرت شیخ شرف الدین یحییٰ منیری کا تمام تر کارنامہ یہی نہیں ہے کہ انہوں نے ہندوستان کے باشندوں کو خدا کا راستہ دکھایا،معرفتِ الٰہی اور تعلق مع اللہ کی ضرورت واہمیت دل نشیں کی، ہزاروں لاکھوں انسانوں کے دلوں میں عشقِ الٰہی اور خداطلبی کی حرارت پیدا کردی اور سلوک و معرفت کے اسرار ونکات اور لطیف و بلند علوم کا اظہار فرمایا، بلکہ بعض دوسرے مصلحینِ امت کی طرح ان کا یہ بھی عظیم وروشن کارنامہ ہے کہ انہوں نے بروقت دین کی حفاظت کا فرض انجام دیا۔ مسلمانوں کے دین وایمان کو غالی صوفیوں کی بے اعتدالیوں،ملحدین کی تحریفات اور باطنیت وزندقہ کے اثرات سے محفوظ رکھااور ان مغالطوں کا پردہ چاک کیا جو بد اعتقاد صوفیوں،جعلی مشائخ اور فلسفۂ باطنیت سے متاثر اشراقیین کی دعوت وتبلیغ سے ہندوستان جیسے دور افتادہ ملک میں سحر کا اثر

رکھتے تھے۔ انہوں نے اپنے مکتوبات میں ان سب عقائد وخیالات پر
کاری ضرب لگائی جن کے پردہ میں پنہاں الحاد وزندقہ پھیل رہا تھا اور
اسلامی عقائد متزلزل ہو رہے تھے اور اسلام کے عقائدِ صحیحہ اور اہلِ سنت
کے مسلک کی نہایت موثر طاقت ورو کالت اور تبلیغ کی"۔ ۲۵؂

مخدوم جہانیان جہاں گشتؒ

جلال الدین مخدوم جہانیان جہاں گشت ۱۴/شعبان ۷۰۷ھ/ ۱۳۰۷ء میں اوچ کے مقام پر پیدا ہوئے۔ ابتدائی درسی کتابیں اپنے چچا سید محمد بخاری اور کچھ دوسرے علماء سے پڑھیں۔ اس کے بعد مختلف علاقوں کا سفر کیا اور وہاں کے علماء سے علمی استفادہ کرتے رہے، شیخ رکن الدین کے ہاتھ پر بیعت کی۔ ۲۶؂ آپ ہمیشہ فکر مند رہتے تھے کہ برادرانِ وطن کے درمیان زیادہ سے زیادہ اسلام کی اشاعت کی جائے۔ آپ کی مساعی سے بہت سے افراد حلقۂ اسلام میں داخل ہوئے۔ اوچ، سندھ، گجرات وغیرہ کے علاقہ میں آپ کے ذریعہ اسلام کی خوب اشاعت ہوئی۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے آپ کی مساعی کا ذکر بہت اچھے انداز میں کیا ہے۔ ۲۷؂ شیخ محمد اکرام کی تصریح کے مطابق مغربی پنجاب کے بہت سے قبیلوں نے آپ کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا، جن میں کھرل راج پوتوں کا مشہور اور بڑا قبیلہ بھی شامل ہے۔ آپ کا فیض ہندوستان کے تمام علاقوں میں پہنچا۔ ۲۸؂ ایوب قادری نے بھی اپنی کتاب میں ان کی مساعی کا ذکر بڑی تفصیل سے کیا ہے۔ ۲۹؂ سید صباح الدین عبدالرحمن لکھتے ہیں:

"حضرت مخدوم جہانیان گشت اچ سے تشریف لائے تو راستے میں
بہت سے غیر مسلم ان کے دستِ مبارک پر اسلام لائے۔" ۳۰؂

شیخ کی وفات ۷۸۵ھ/ ۱۳۸۴ء میں ۷۸/ سال کی عمر میں ہوئی۔ آپ کا مزار ملتان میں ہے۔

سید گیسو دراز بندہ نوازؒ

سید محمد گیسودراز بندہ نواز ۷۲۰ھ/ ۱۳۲۰ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ آپ

کی عمر دس (۱۰) سال کی تھی کہ والد سید محمد یوسف کا دولت آباد میں انتقال ہو گیا۔ حفظِ قرآن کے بعد علوم دینیہ کی تکمیل انیس (۱۹) سال کی عمر میں کی، پھر خواجہ نصیر الدین چراغ دہلوی کی خدمت میں حاضر ہو کر سلوک کی منزلیں طے کیں اور بیعت ہو کر خلافت و اجازت حاصل کی۔آپ غیر مسلموں کے ساتھ مناظرہ میں بڑی دل چسپی لیتے تھے، تاکہ اسلام کی صداقت وحقانیت ان پر آشکارا ہو اور وہ اسلام میں داخل ہو جائیں۔آپ کے ملفوظات 'جوامع الکلم' سے آپ کے بہت سے مناظروں کا پتہ چلتا ہے۔آپ کا انتقال ۸۲۵ھ/ ۱۴۲۲ء میں ہوا۔مزار مبارک گلبرگہ میں ہے۔ آپ کی تبلیغی مساعی کے حوالے سے پروفیسر آرنلڈ نے لکھا ہے:

"چودھویں صدی عیسوی کے آخر میں سید حسین گیسو دراز، جن کو سید مخدوم گیسودراز بھی کہا جاتا ہے،گلبرگہ میں بڑے پیر ہوے۔انہوں نے پونہ کے ہندوؤں کو مسلمان کیا اور بیس (۲۰) برس کے بعد بلگام کے ہندوؤں کو مسلمان کرنے میں ان کو بہت کام یابی ہوئی۔"[۳۱]

آپ نے نہ صرف خانقاہ میں بیٹھ کر رشد و ہدایت کی محفل گرم کی اور بے شمار خلقِ خدا کو فائدہ پہنچایا، بلکہ تصنیف وتالیف کے ذریعہ بھی دین کی خدمت کی۔شیخ محمد اکرام نے لکھا ہے:

"حضرت سید گیسو دراز کی تصانیف کی تعداد آپ کی عمر کے سنین کے مطابق ایک سو پانچ بتائی جاتی ہے، واللہ اعلم بالصواب۔سیر محمدی میں ۳۱ر کتابوں کے نام گنائے گئے ہیں، جو زیادہ تر تصوف میں ہیں،لیکن حقیقت یہ ہے کہ علومِ اسلامی کا کوئی شعبہ نظر انداز نہیں ہوا۔آپ نے کلام مجید کی ایک تفسیر سلوک کے رنگ میں لکھی اور کشاف کے طرز پر ایک اور تفسیر شروع کی تھی،لیکن پانچ سپاروں سے آگے نہ جاسکی۔ کشاف پر آپ نے حواشی بھی لکھے۔ان کے علاوہ شرح فصوص الحکم، معارف شرح عوارف،شرح فقہ اکبر (عربی وفارسی) رسالہ سیرۃ النبی، شرح آداب المریدین، اسماء الاسرار قابل ذکر ہیں۔موخر الذکر دونوں کتابیں چھپ چکی ہیں۔"[۳۲]

شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ

شیخ عبدالقدوس گنگوہی ۸۵۲ھ/ ۱۴۴۸ء میں بارہ بنکی صوبہ اتر پردیش کے ایک قصبہ 'ردولی' میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم وتربیت اپنے والد شیخ اسمٰعیل سے حاصل کی ۔ درسیات کی اعلی کتابوں کا ذاتی مطالعہ کیا۔ جب عبادتِ الٰہی اور جذبہ شوق نے زیادہ اثر دکھایا تو شیخ احمد عبدالحق ردولوی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے بیعت ہو گئے۔

شریعت کے امور بجالانے میں وہ ذرہ برابر کوتاہی یا کمی بیشی نہیں کرتے تھے۔ تمام مسائل میں مسلکِ اہل سنت والجماعت کی سختی سے پابندی اور فقہ حنفی کی پیروی کرتے تھے۔ شرعی پابندی کا یہ عالم تھا کہ اگر کسی چیز میں ذرہ برابر شبہ ہو جاتا تو اس سے پرہیز کرتے۔

آپ کے فیوض وبرکات بے شمار لوگوں تک پہنچے اور تصوف میں جو غلو پایا جاتا تھا اس کا ازالہ ہوا۔ آپ نے مشائخِ چشت کے اصولوں سے ہٹ کر سلاطین وقت سے ربط وضبط رکھا، ان کی اصلاح پر زور دیا اور گاہے گاہے اپنے خطوط کے ذریعے انھیں نصیحت کرتے کہ حکومت کے امور شریعتِ اسلامی کی روشنی میں انجام دیے جائیں۔ لودھی، بابر اور ہمایوں کے نام انہوں نے جو خطوط لکھے ہیں وہ اسی کی غمازی کرتے ہیں۔

شیخ عبدالقدوس گنگوہی نے شروع میں ذکر اللہ اور تربیتِ خلق کی مجلس اپنے وطن ردولی میں ہی گرم کی۔ کسی وجہ سے وہاں کے حالات دگرگوں ہوئے تو شاہ آباد چلے آئے، جہاں اڑتیس (۳۸) برسوں تک ارشاد وتلقین کی مجلس آراستہ رہی۔ آخرِ عمر میں گنگوہ چلے آئے۔ یہیں ان کا انتقال ۹۴۴ھ/ ۱۵۳۷ء میں ہوا۔ ان کا شمار حنفی مسلک کے ترجمان اور ایک بلند پایہ مصنف کی حیثیت سے ہوتا ہے۔ فصوص الحکم پر حاشیہ لکھنے کے ساتھ رسالۂ قدسیہ، غرائب الفوائد، رشد نامہ، مظہر العجائب اور مکتوبات قدوسیہ آپ کی ہی تصانیف ہیں۔ ۳۳؎

آپ کے خلفا کی تعداد بہت ہے، لیکن آپ کا سلسلہ شیخ جلال الدین تھانیسری کے ذریعہ آگے بڑھا۔ آپ کی اولاد میں ایک اہم نام ملا عبدالنبی گنگوہی کا ہے، جو بڑے پایہ کے عالم تھے۔ ملا عبدالنبی کے علم وتقویٰ کا یہ عالم تھا کہ اکبر بادشاہ ان کی جوتی سیدھی کرتا تھا، مگر بعد میں بعض وجوہ سے وہ ان سے متنفر ہوگیا تھا۔ ۳۴؎ ملا عبدالنبی کے صاحب زادوں ابوالفیض اور فیضی نے اپنے علم وفضل کی وجہ سے دربارِ اکبری میں بڑی نام وری حاصل کی۔

شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ

شاہ عبدالحق محدث دہلوی (۹۵۸ھ/ ۱۵۵۱ئ-۱۰۵۲ھ/ ۱۶۴۲ئ) بھی اکبر اور جہاں گیر کے عہد میں گزرے ہیں۔ آپ علومِ دینیہ کی تکمیل کے بعد اٹھائیس (۲۸) برس کی عمر میں حجاز تشریف لے گئے اور تین چار برس مکہ معظّمہ اور مدینہ منورہ میں رہ کر علم حدیث کی تکمیل کی۔ پھر وہاں سے واپس آکر ہندوستان میں درس وتدریس اور تصنیف وتالیف میں مصروف ہوئے۔ ان کا ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے علم حدیث کو ہندوستان میں رواج دیا۔ اس کے علاوہ بھی انہوں نے مختلف موضوعات پر متعدد کتابیں تحریر کیں اور امت کی اصلاح کی فکر میں لگے رہے۔ ۳۵؎ سید صباح الدین عبد الرحمن، امام حسن صغانی کی مشارق الانوار اور علاء الدین علی کی کنز العمال کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''اگر ان کتابوں سے قطع نظر کرلیا جائے تو ہندوستان میں حدیث کی صحیح خدمت یہاں مسلمانوں کی سلطنت قائم ہونے کے ساڑھے تین سو برس بعد شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے کی۔ انہوں نے حدیث پر ایک درجن کتابیں لکھیں، جن میں مشہور مشکوٰۃ کی عربی شرح 'لمعات التنقیح' اور فارسی شرح 'اشعۃ اللمعات' ہیں۔ شیخ مجدالدین فیروز آبادی کی سفرالسعادۃ کی فارسی شرح بھی انہی نے لکھی، جو حافظ ابن قیم کی زادالمعاد کے برابر سمجھی جاتی ہے۔ انہی کی وجہ سے دہلی علم حدیث کا دارالسلطنت بن گیا۔'' ۳۶؎

شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانیؒ

شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی ۱۴/شوال ۹۷۱ھ/ ۲۶/مئی ۱۵۶۴ء میں سرہند کے ایک علمی خانوادے میں پیدا ہوے۔ ابتدائی تعلیم وتربیت اپنے والد ماجد شیخ عبدالاحد سے حاصل کی، پھر سیال کوٹ پہنچے اور وہاں کے علمائے کبار ومحدثین سے علم کی تکمیل کر کے سترہ (۱۷) سال کی عمر میں وطن واپس لوٹے اور درس وتدریس میں مشغول ہوگئے۔ بعد میں خواجہ باقی باللہ کی صحبت اختیار کی، جنھوں نے جلد ہی آپ کو خلافت سونپ دی۔ آپ کا انتقال ۱۰۳۴ھ/ ۱۶۲۸ء میں ہوا۔

شہنشاہ اکبر کے عہد میں اسلام کو جو نقصان پہنچا اس کی نظیر دوسرے سلاطین کے عہد میں نہیں ملتی۔ اس سے یہاں نہ صرف اسلام کمزور ہوا، بلکہ مسلمانوں کی دینی و مذہبی حالت بھی کافی کمزور ہوگئی تھی اور دینی حمیت رکھنے والے مسلمان اس عظیم فتنہ کو روکنے میں بے بس نظر آرہے تھے۔

شیخ احمد سرہندی نے اپنے تجدیدی کام کا آغاز کیا تو اکبر کا انتقال ہو چکا تھا۔ گو اس کے انتقال سے بے دینی کا جو شعلہ بھڑک رہا تھا وہ کسی حد تک سرد ضرور ہو گیا تھا، مگر اس کے اثرات پوری طرح برقرار تھے۔ خود جہاں گیر بھی اس بلائے عظیم کا اسیر تھا۔ چنانچہ حضرت مجدد نے پہلے اس کے مقرب ترین امراء کو اپنے وعظ وارشاد سے متاثر کیا، پھر ان کو واسطہ بنا کر اسلامی تعلیمات سے بادشاہ کو مستفیض کیا۔ ادھر اپنے خلفاء ومریدین کو بڑی تعداد میں تیار کر کے ملک کے کونے کونے میں روانہ کیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جہاں گیر بھی بہ تدریج حضرت کی نصیحت اور تعلیمات سے متاثر ہو گیا اور دین کی حمایت اور اسلام کو عروج واستحکام بخشنے کی کافی حد تک کوشش کرنے لگا۔

حضرت مجدد نے فتنۂ اکبری کو روکنے کے لیے جہاد باللسان کے ساتھ جہاد بالقلم بھی کیا۔ علماء، صوفیہ، مشائخ، شیعہ، سنی، جاہل عوام، امراء اور ارکانِ سلطنت کے علاوہ غیر مسلموں کی اصلاح وتربیت پر توجہ دی، ان کے اندر اسلام سے جو بغاوت پائی جاتی ہے اس کا انسداد کیا اور دین کے مختلف شعبوں میں جو اضمحلال پیدا ہو گیا

تھا، اس کے ازالہ کے لیے مثبت لائحہ عمل پیش کیا۔ ان کے مکتوبات کے بارے میں پروفیسر محمد فرمان رقم طراز ہیں:

"شیخ احمد سرہندی کے مکتوبات کے مطالعہ سے آپ کی علمیت، معرفت، خلوص اور شرع کی پابندی کا ایک ایسا حسین، دل کش اور مستحکم منظر آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے جس سے پڑھنے والا اپنے دل میں ایک سرور اور سوز محسوس کرتا ہے۔ ۳۷"

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلی کے ایک علمی خانوادے میں ۱۱۱۴ھ/ ۱۷۰۳ء میں پیدا ہوے۔ آپ کے عہد میں مسلمانوں کی نہ صرف سیاسی حالت ناگفتہ بہ تھی، بلکہ وہ اخلاقی اور معاشرتی حیثیت سے بھی بہت خستہ حال ہو گئے تھے اور طرح طرح کی خرابیاں ان میں در آئی تھیں۔ ان کی اصلاح اور انسداد کے لیے انھوں نے تصنیف و تالیف اور وعظ و تذکیر کا سہارا لیا۔ ان کی کوشش تھی کہ ایک طرف مسلمانوں میں اتحاد پیدا ہو اور پھر سے ایک مضبوط سلطنت وجود میں آئے، دوسری طرف وہ اپنی اخلاقی خرابیوں کو دور اور غیر اسلامی طریقوں اور رسوم و روایات کو ترک کر کے دورِ اول کے مسلمانوں جیسی زندگی اختیار کرلیں۔ ۳۸

شاہ صاحب نے اصلاحِ معاشرہ پر بھی زور دیا اور مسلمانوں میں ہندوؤں کے اثرات سے شادی بیاہ کی جو غلط رسوم جڑ پکڑ گئی تھیں ان کے خلاف آواز اٹھائی۔ انھوں نے مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے درمیان اختلاف کی دیوار پاٹنے کی بھی کام یاب کوشش کی۔

ان کا یہ کارنامہ بھی اہم ہے کہ انھوں نے قرآن مجید کا ترجمہ فارسی زبان میں کر کے عوام کے سامنے پیش کیا، تاکہ لوگ کلام اللہ کو اچھی طرح سمجھ کر اس پر عمل کریں۔ آپ کی یہ سعی مقبول ہوئی اور گھر گھر قرآن مجید کے معانی و مطالب کا چرچا ہونے لگا۔

انھوں نے بہ کثرت مختلف موضوعات پر کتابیں تحریر کیں۔ تفسیر، حدیث، فقہ، تاریخ اور تصوف پر ان کی اہم تصانیف ہیں، جن میں حجۃ اللہ البالغہ منفرد نوعیت کی کتاب شمار کی جاتی ہے۔ آپ کی وفات ۱۱۷۶ھ/ ۱۷۶۲ء میں ہوئی اور دہلی میں بہ مقام مہندیاں سپرد خاک ہوئے۔

مرزا مظہر جان جاناںؒ

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے ہم عصر حضرت مرزا مظہر جان جاناں (۱۱۱۱ھ/ ۱۶۹۹—۱۱۹۵ھ/ ۱۷۸۰ئ) نے بھی مسلمانوں کے کھوئے ہوے وقار کی بازیافت اور اسلامی علوم وفنون کی ترویج واشاعت کے لیے کارہائے نمایاں انجام دیے۔ انھوں نے درس وتدریس کے علاوہ وعظ ونصیحت کا کام بھی کیا اور مسلمانوں کو نصیحت کی کہ وہ اپنے اعمال وافعال کا محاسبہ کریں اور امتِ واحدہ کا مظاہرہ کرتے ہوے دینِ اسلام پر ثابت قدم رہیں۔ وہ سلاطین وامراء سے بھی کہتے تھے کہ وہ اپنے جاہ ومنصب کا احترام کریں اور اللہ نے انھیں جس خدمت پر مامور کیا ہے اس سے ہرگز غفلت نہ برتیں۔ اپنی بات لوگوں تک پہنچانے کے لیے انھوں نے بڑی تعداد میں خطوط لکھے۔

مرزا صاحب نے اپنے دور میں سیاسی، مذہبی، سماجی اور اقتصادی افراتفری کے باوجود بڑی حد تک کوشش کی کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان جو دوری اور کشیدگی پائی جاتی ہے، اس کا ازالہ ہو سکے۔ چنانچہ انھوں نے ہندوؤں کی مذہبی کتاب وید کو الہامی کتاب مانتے ہوے مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ اس کے متعلق غلط اور منفی نظریہ قائم کرنے سے احتراز کریں، کیوں کہ یہ دین (ہندومت) پہلے ایک مرتب دین تھا، اب منسوخ ہو گیا ہے۔ ۳۹ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہندومت کے سلسلے میں آپ کا جو مثبت نظریہ تھا اس سے ہندوؤں کے دلوں میں اسلام اور مسلمانوں سے قربت کا جذبہ پیدا ہو۔

شاہ اسمٰعیل شہیدؒ

شاہ اسمٰعیل شہید(۱۱۹۳ھ/ ۱۷۷۹ئ۔ ۱۲۴۶ھ/ ۱۸۳۱ئ) کا شمار اپنے زمانہ کے بڑے علماء میں ہوتا ہے ۔ شاہ ولی اللہ نے مسلمانوں کی اصلاح اور قرآن وحدیث کی تعلیم عام کرنے کا جو کام شروع کیا تھا اس کو سب سے زیادہ ترقی شاہ اسمٰعیل نے دی ۔ وہ کئی اہم کتابوں کے مصنف ہیں، جن میں تقویۃ الایمان سب سے زیادہ مقبول ہوئی ۔ اس کتاب میں انھوں نے بتایا ہے کہ وہی زندگی، تہذیب اور معاشرت اسلامی ہے جو قرآن و سنت کے مطابق ہو ، اس کے علاوہ کوئی زندگی یا تہذیب یا معاشرت اسلامی نہیں کہی جاسکتی۔ اس کتاب نے مسلمانوں میں ایک بڑا ذہنی انقلاب پیدا کیا۔ عمومی دعوت واصلاح کے اس عظیم کام کے ساتھ آپ نے جہاد فی سبیل اللہ کے لیے اپنے آپ کو تیار کیا۔ آپ نے احمد شہید کی نہ صرف ہم رکابی اور رفاقت کا حق ادا کیا، بلکہ اس کام میں آپ کی حیثیت تحریک کے ایک قائد و امیر کے وزیر و نائب کی تھی ۔ آپ نے بالا کوٹ کے معرکہ میں شہادت کا شرف حاصل کیا۔ ۴۰؎

سید احمد شہیدؒ

سید احمد شہید(۱۲۰۱ھ/ ۱۷۸۷ئ۔ ۱۲۴۶ھ/ ۱۸۳۱ئ) شاہ عبد العزیز محدث دہلوی کے شاگرد اور مرید تھے اور ان کے ہاتھ پر شاہ اسمٰعیل نے بیعت کی تھی ۔ دونوں کی کوششوں سے تجدیدِ دین کی ایک نئی تحریک شروع ہوئی، جس کو ہندوستان میں سب سے پہلی اسلامی تحریک سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے ۔ انھوں نے مل کر مسلمانوں کی ایک مخلص جماعت پیدا کی، جس نے جہاد کا علم بلند کیا۔ اس جماعت کو اگر چہ کامیابی نصیب نہیں ہوئی اور بالا کوٹ میں دونوں حضرات شہید ہوگئے، لیکن جس طرح کربلا میں امام حسینؓ کی شہادت کے بعد اسلام زندہ ہوا ، اسی طرح بالا کوٹ میں جماعت مجاہدین کی شہادت کے بعد ہندوستان میں اسلام کا پھر سے احیاء ہوا، کیوں کہ ان دونوں بزرگوں کے پیروؤں نے ان کی تعلیمات کو پنجاب سے لے کر بنگال تک عام کیا۔

سید احمد شہید نے لوگوں کے دلوں میں جذبۂ جہاد ابھارنے کے علاوہ بڑی تعداد میں برادرانِ وطن کو اپنے کلماتِ حسنہ اور وعظ وارشاد کے ذریعہ حلقۂ اسلام میں داخل کیا۔ مولوی عبد الاحد کا بیان ہے کہ سید صاحب کے ہاتھوں پر چالیس ہزار سے زائد افراد مسلمان ہوئے۔ [۴۱]

آپ کے ارشادات واقوال کو آپ کے دو خلفاء شاہ اسمٰعیل شہید اور مولانا عبد الحی (۱۲۴۲ھ/ ۱۸۲۷ئ) نے فارسی زبان میں کتاب کی صورت میں مرتب کیا ہے، جس کا نام 'صراط مستقیم' ہے۔ اس میں ہندوستانی مسلمانوں کی مذہبی ومعاشرتی خرابیوں کا بالتفصیل بیان ہے اور مرض کی تشخیص کے ساتھ علاج بھی تجویز کیا گیا ہے۔

ہندوستان میں مسلم دورِ حکومت میں علماء وصوفیہ کی خدمات اور کارناموں سے ظاہر ہے کہ انھوں نے یہاں اسلام کی اشاعت اور دین کی خدمت کی راہ میں غیر معمولی قربانیاں دیں اور عظیم الشان جدوجہد کی۔ آج ہندوستان میں اسلام کے جو اثرات ہم دیکھ رہے ہیں وہ انہی کی قربانیوں اور جدّو جہد کی مرہونِ منت ہیں۔

حواشی ومراجع

۱۔ سید صباح الدین عبدالرحمن، ہندوستان کے سلاطین، علماء اور مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر، مطبع معارف، اعظم گڑھ، ۱۹۶۴ئ، ص۹

۲۔ امیر حسن سنجری، فوائد الفواد، ترقی اردو بیورو، دہلی، ۱۹۹۱ئ، ص۳۹۹

۳۔ داتا گنج بخش ہجویری، کشف المحجوب، مطبوعہ پاکستان، ص۵۷۔ آب کوثر، ص۷۸

۴۔ داراشکوہ، سفینۃ الاولیائ، نفیس اکیڈمی، کراچی، ۱۹۵۹ئ، ص۲۱۰

۵۔ آب کوثر، ص۸۵۔ اعجاز الحق قدوسی، تذکرہ صوفیائے پنجاب، سلیمان اکیڈمی، کراچی، ۱۹۶۲ء، ص۳۷۹–۳۸۲

۶۔ آب کوثر ص ۸۳

۷۔ محمود شیرانی، پنجاب میں اردو، اتر پردیش اکیڈمی، لکھنؤ، ۱۹۹۰ئ ص۳۵

۸۔ مولانا اسحاق بھٹی، علم حدیث میں برِّ اعظم پاک وہند کا حصہ، مرکزی مکتبہ اسلامی، نئی دہلی، ۱۹۸۲ئ، ص۷۰–۷۱

۹۔ رحمن علی، تذکرہ علمائے ہند، مطبوعہ کرچی، ۱۹۶۱ئ، ص۱۶۲۔ فارسی، مطبوعہ نول کشور، ۱۹۱۴ء ص۴۸

۱۰۔ سید صباح الدین عبد الرحمن، بزم مملوکیہ، مطبع معارف، اعظم گڑھ، ۱۹۵۴ئ، ص ۳۳
۱۱۔ شاہ معین الدین ندوی، مقالات سلیمانی، مطبع معارف اعظم گڑھ، ۱۹۶۸ئ، ج ا، ص ۴
۱۲۔ عبد الحی حسنی، نزہۃ الخواطر، دائرۃ المعارف العثمانیۃ، حیدرآباد، ۱۹۶۲ئ، ج ا، ص ۱۰۵—۱۰۸
۱۳۔ ٹی۔ڈبلو۔آرنلڈ، دعوتِ اسلام، مترجم: محمد عنایت اللہ، طبع فیض عام، آگرہ، ۱۸۹۸ئ، ص ۳۰۱
۱۴۔ ملا عبد القادر بدایونی، منتخب التواریخ، مطبوعہ کلکتہ، ۱۸۶۸ئ، ج ا، ص ۵
۱۵۔ ابو الفضل، آئین اکبری، مطبوعہ کلکتہ، ص ۲۷۰
۱۶۔ سید ابوالحسن علی ندوی، تاریخ دعوت وعزیمت، مجلس تحقیقات و نشریات اسلام، لکھنؤ، ۲۰۰۰ئ، ج ۳، ص ۳۰ ۱۷۔ حوالۂ سابق ج ۳، ص ۳۵
۱۸۔ سید صباح الدین عبد الرحمٰن، بزم صوفیہ، مطبع معارف، اعظم گڑھ، ص ۱۷۶
۱۹۔ تاریخ دعوت وعزیمت، ج ۳، ص ۱۶۸—۱۶۹
۲۰۔ عبد المجید سالک، مسلم ثقافت ہندوستان میں، ادارۂ ثقافت اسلامیہ لاہور، ص ۲۴۵
۲۱۔ مسلم ثقافت ہندوستان میں، ص ۲۴۸ ۲۲۔ آبِ کوثر، ص ۳۲۸—۳۲۹
۲۳۔ بزم صوفیہ، ص ۴۰۸ ۲۴۔ تاریخ دعوت وعزیمت، ج ۳، ص ۲۰۲ ۲۵۔ حوالۂ سابق
۲۶۔ عبد الحق محدث دہلوی، اخبار الاخیار، فرید بک ڈپو، دہلی، ص ۳۰۸
۲۷۔ حوالۂ سابق، ص ۳۰۷—۳۱۰ ۲۸۔ آب کوثر، ص ۲۸۴
۲۹۔ ایوب قادری، مخدوم جہانیان جہاں گشت، مطبوعہ کراچی، ۱۹۶۳ئ، ص ۲۰۳—۲۱۰
۳۰۔ بزم صوفیہ، ص ۵۰۶ ۳۱۔ دعوت اسلام، ص ۲۸۸ ۳۲۔ آب کوثر، ص ۳۷۰
۳۳۔ شیخ رکن الدین، لطائف قدوسی، مکتبہ مجتبائی، دہلی، ۱۳۱۱ھ، ص ۶۰
۳۴۔ پروفیسر محمد اسلم، دین الٰہی اور اس کا پس منظر، ندوۃ المصنفین، دہلی، ۱۹۶۹ئ، ص ۵۶
۳۵۔ اخبار الاخیار، ص ۱۱—۱۵۔ نیز ملاحظہ کریں راقم الحروف کا مضمون: شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی: اصلاحی وتجدیدی خدمات کی روشنی میں، سالانہ مجلہ دراسات دینیہ فیکلٹی دینیات، علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ، ۲۰۰۵ء
۳۶۔ ہندوستان کے سلاطین، علما اور مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر، ص ۵۷—۵۸
۳۷۔ پروفیسر محمد فرمان، حیات مجدد، مطبوعہ لاہور، ۱۹۵۸ئ، ص ۲۶۲
۳۸۔ ثروت صولت، ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ، مرکزی مکتبہ اسلامی، نئی دہلی، ۱۹۹۸ئ، ج ۲، ص ۳۹۶—۳۹۷
۳۹۔ مقامات مظہری، ص ۱۲۸ ۴۰۔ تاریخ دعوت وعزیمت، ج ۵، ص ۳۷۹
۴۱۔ حوالۂ سابق، ج ۵، ص ۳۷۶

ترجمہ و تلخیص

مولانا فراہی کی تصنیف 'جمہرۃ البلاغۃ'

__________ ڈاکٹر احمد مطلوب (بغداد)

مترجم: ابوسعد اعظمی

عربی بلاغت قدیم اصحابِ علم کی دل چسپی کا خاص موضوع رہی ہے۔ سیبویہ کی 'الکتاب'، ابو عبیدہ کی 'مجاز القرآن' اور فرّاء کی 'معانی القرآن' میں اس کے ابتدائی آثار نظر آتے ہیں۔ پھر ثعلب کی قواعد الشعر اور ابن المعتز کی شاہ کار تصنیف 'البدیع' میں وہ پوری آب وتاب کے ساتھ جلوہ گر ہوئی۔ اس کے بعد اس موضوع پر تصنیف وتالیف کا ایک طویل سلسلہ چل پڑا اور بہت سی تصانیف منظر عام پر آئیں، جن میں سے چند یہ ہیں: کتاب الصناعتین لابی ہلال العسکری، العمدۃ لابن رشیق، اسرار البلاغۃ، دلائل الاعجاز لعبد القاہر الجرجانی، المثل السائر فی ادب الکاتب والشاعر اور الجامع الکبیر لضیاء الدین ابن الاثیر، البرہان اور التبیان لابن الزملکانی، نھایۃ الایجاز لفخر الدین الرازی، بدیع القرآن اور تحریر التحبیر للمصری۔

ان کتابوں کے طریقۂ تصنیف میں تنوع کے ساتھ ان میں ادب کی چاشنی بھی پائی جاتی ہے، جس نے بلاغت کو علماء ومحققین کے درمیان ایک علیحدہ فن کی حیثیت سے متعارف کرایا ہے۔ علوم کی تقسیم میں بلاغت کو ایک مقام دیا گیا ہے۔ چھٹی صدی ہجری میں خوارزم کے ایک عالم سکاکی (م ۶۲۶ھ) نے 'مفتاح العلوم' کے نام سے ایک کتاب تالیف کی۔ اس کے تیسرے حصے کو بلاغت کے ساتھ مخصوص کر کے اس کی تین قسمیں بیان کی ہیں: علم المعانی، علم البیان اور وہ صورتیں جنھیں کلام میں

حسن پیدا کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے ۔اسے بدرالدین بن مالک (م۶۸۶ھ) نے اپنی کتاب 'المصباح' میں علم البدیع کے نام سے موسوم کیا ہے ۔

عرصۂ دراز تک مطالعۂ بلاغت کے ضمن میں سکاکی منہج ہی غالب رہا۔سب سے پہلے بدرالدین بن مالک اس سے متأثر ہوئے ،اس کے بعد خطیب قزوینی اپنی کتاب 'التلخیص'اور 'الایضاح' میں اسی منہج پر کاربند نظر آئے۔تشریحات وتلخیصات کا سلسلہ قائم رہااورسعد الدین التفتازانی ،سبکی ،ابن یعقوب المغربی وغیرہ اس فن کے ماہرین کی حیثیت سے معروف ہوئے۔

بیسویں صدی عیسوی کے آغاز میں بعض مؤلفین نے بلاغت کے موضوع پر چند اہم کتابیں تحریر کی ہیں ،اگرچہ وہ سکاکی کے متعین کردہ خطوط سے باہر نہیں نکل سکے ۔بعد کے لوگوں نے جدید طرز اختیار کرنے کی کوشش کی ،لیکن وہ بھی بہت زیادہ بارآور ثابت نہ ہوئی اور کوئی ایسی علمی اور نادر تحقیق وجود میں نہ آسکی جو بلاغت کو ذہن سے قریب کرسکے ۔البتہ 'فن القول' کے مصنف مرحوم امین الخولی نے اس سلسلے میں جس جدید طریقۂ کار کی نشان دہی کی اس کی آج تک تطبیق نہ ہوسکی ۔

مطالعات کا سلسلہ برابر جاری رہااور علماء مختلف پہلوؤں سے غور وخوض کرتے رہے، یہاں تک کہ بعض محققین نے عربی بلاغت کوترک کرنے اور بلاغت کے مغربی اسلوب کو اختیار کرلینے کی دعوت دی ،جیسا کہ ڈاکٹر عبدالسلام المسدی اور ان کے ہم مشرب دوسرے مغرب زدہ لوگوں کا خیال ہے ۔انھوں نے اسلوب کی تین سطحیں قرار دی ہیں :صوتی سطح،ترکیبی سطح اور دلالی سطح ،حالاں کہ یہ بلاغت کی وہی سہ رخی تقسیم ہے جسے سکاکی نے تین علوم میں محصور کیا ہے:علم المعانی،علم البیان اورعلم البدیع ۔

بلاغت کے موضوع پر تحقیقات کا سلسلہ ختم نہیں ہوا، بلکہ بلادعجم میں بعض علماء نے قرآن کریم کی خدمت کے طور پر اس موضوع سے دل چسپی لی ۔ان میں ایک نمایاں نام مولانا عبدالحمید الفراہیؒ کا ہے۔انھوں نے اپنی کتاب 'جمهرة البلاغة' (مطبوعہ ۱۳۴۰ھ) میں عجمی بلاغت کے بجائے عربی بلاغت اختیار کرنے کی آواز

اٹھائی۔لیکن افسوس کہ اس کتاب کے نسخے بلادِ عربیہ تک پہنچنے سے پہلے ہی ختم ہو گئے۔

قرآنیات سے متعلق مولانا فراہیؒ کی متعدد تصانیف ہیں۔ان میں سے ایک اہم تصنیف 'جمہرۃ البلاغۃ' بھی ہے۔ڈاکٹر محمد اجمل ایوب اصلاحی نے اس کتاب کے سلسلے میں لکھا ہے کہ ''یہ مولانا فراہی کی وہ گراں قدر تصنیف ہے جس میں انہوں نے نظریۂ محاکاۃ کی مخالفت کی ہے، جس پر ارسطو کے فنِ بلاغت کا تمام تر دارومدار ہے۔مولانا کا خیال ہے کہ عربی بلاغت اس نظریہ سے متأثر ہو کر راہ راست سے ہٹ گئی ہے۔اس ضمن میں انھوں نے امام عبدالقاہر جرجانیؒ کے علمی تبحرّ کا اعتراف کرتے ہوئے ان پر تنقید بھی کی ہے اور فنِ بلاغت کو ایسی اساس پر تعمیر کرنے کی دعوت دی ہے جس کا ماخذ قرآن کریم اور کلامِ عرب ہو''۔[۱]

علامہ شبلی نعمانیؒ کو 'جمہرۃ البلاغۃ' بہت پسند آئی۔انہوں نے اس کے بعض اہم مباحث بالخصوص نظریۂ محاکاۃ کی تلخیص کرکے اردو مجلہ 'الندوہ' میں شائع کیا۔یہ کتاب مولانا فراہیؒ کی وفات کے بعد منظرِ عام پر آئی۔ڈاکٹر اصلاحی نے تحریر کیا ہے کہ ''بلادِ عربیہ میں پہنچنے سے قبل ہی کتاب کے سارے نسخے ختم ہو گئے۔عربی بلاغت کی تاریخ میں یہ اپنی نوعیت کی منفرد کتاب ہے''۔[۲]

جمہرہ البلاغۃ واقعتاً اپنی نوعیت کی ایک منفرد ادبی کاوش ہے، اس لیے کہ فاضل مصنف نے اس کی اساس بلاغت کی بنیادوں سے ہٹ کر دوسری چیزوں پر رکھی ہے۔انھوں نے اسے دو حصوں میں تقسیم کیا ہے: (۱) عمومی قسم (۲) خصوصی قسم۔ان کے علاوہ کچھ دوسرے مباحث ہیں، جن کا تذکرہ الگ سے کیا ہے۔

کتاب کا آغاز ایک مقدمہ سے ہوتا ہے۔مولانا فراہیؒ لکھتے ہیں: ''پاک ہے وہ ذات جس نے بنی آدم کو تمام مخلوقات پر برتری عطا کی اور انھیں جان دار اور بولنے والا بنایا۔اسی طرح حضرت محمد ﷺ کو تمام انسانوں سے افضل بنایا اور آپ کو جوامع الکلم عطا فرمائے۔ہمیں اول و آخر اپنے رب کا، جو رحمن ہے، شکر یہ ادا کرنا چاہیے، اس لیے کہ اس نے ہمیں بیان سکھایا اور ہم پر قرآن کریم نازل کیا۔اس شخص

نے درحقیقت شکر ادا نہیں کیا جو نعمت سے نا آشنا رہا اور اسے ضائع کردیا، یا اسے تبدیل کردیا اور اس کا صحیح مقام سمجھنے میں غلطی کر بیٹھا۔ بیان کے اسرار ورموز اور اس کے فضائل جاننا ہمارے لیے ضروری ہے، اسی طرح اعجازِ قرآن اور اس کے دلائل کا جاننا بھی ناگزیر ہے، تاکہ ہم اپنی فطرت کے صحیح عنصر کی تکمیل کرلیں اور سرچشمۂ وحی کے کوثرِ صافی سے سیراب ہوں۔''[۳]

آگے مولانا فراہی مزید رقم طراز ہیں: ''بیان کی حیثیت دراصل سائے کی سی ہے اور اثر اس گویائی میں ہوتا ہے جو انسان کو راہِ راست پر قائم رکھتی ہے۔ اسی طرح نطق وحیِ الٰہی کا سایہ اور اللہ تعالی کا بلند کلمہ ہے۔ لہٰذا علم البیان کی ترجیحات کی تلاش ہمیں حکمتِ الٰہیہ تک پہنچا دیتی ہے''۔[۴]

یہ بیان کی بالکل نئی تعبیر ہے۔اس کے ذریعہ مؤلف اس فرق کو واضح کرنا چاہتے ہیں جو ہمارے علوم وفنون، بالخصوص اس علم میں غور وخوض کرنے اور دوسری قوموں کے اس کو موضوعِ بحث بنانے کے درمیان ہے۔ ''دیگر قوموں نے اسے حقیر، کم تر اور دنیاوی نقطۂ نظر سے دیکھا ہے، پس اس کی تباہ کاریاں ان کے شامل حال ہوگئیں، اس کی باطل چیزوں نے انہیں حق سے دور کردیا اور ان پر تہ بہ تہ تاریکیوں کا غلاف چڑھ گیا''۔ لیکن کلام حَسَن کی معرفت کیسے حاصل ہو؟ مؤلف کے خیال میں یہ بڑا ہی مشکل امر ہے۔ اگرچہ ''لوگوں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ کلام میں حُسن بھی ہوتا ہے اور قبح بھی، بلندی بھی ہوتی ہے اور سطحیت بھی۔ اس کے باوجود حسن کے موقع ومحل کی تعیین اور ایک کلام کو دوسرے پر فضیلت دینے کے سلسلے میں ان کا اختلاف ہے، یہاں تک کہ نقد کی سب سے زیادہ بصیرت رکھنے والا شخص بھی اس معاملہ میں اپنے ہم مثل دوسرے کا مخالف ہوتا ہے۔ ہر لذیذ اور پسندیدہ شی کے باب میں عموماً ایسا ہی ہوتا ہے، اس لیے کہ بیش تر پسندیدہ اشیاء بسیط نہیں ہوتیں اور ان میں حسن کے اسباب ایک سے زائد ہوا کرتے ہیں''۔[۵] اسی وجہ سے ناقدانہ فیصلوں میں اختلاف ہوتا ہے۔ ''کلام کے اندر ایسا حسن اور بلندی ہونے کے باوجود، جو ذوق کے لیے قابلِ

تسلیم ہے، نقد اور تمیز کی راہ دشوار ہو جاتی ہے اور حسن کی حقیقت اور بلاغت کے راز کی معرفت اس حد تک مبہم ہو جاتی ہے کہ ایک شعر یا نثر سامنے ہوتا ہے جو بیش تر ناقدین اور عام اہل ذوق کو پسند آتا ہے، لیکن اگر ان سے سوال کیا جائے کہ وہ انھیں کیوں پسند آیا ہے؟ تو ان کے جوابات میں تضاد ہوتا ہے۔ اسی طرح جب کوئی آواز ان کی سماعت سے ٹکراتی ہے یا انھیں خوشبو محسوس ہوتی ہے، اس وقت ان سے سوال کیا جائے کہ یہ کس سمت سے آرہی ہے؟ تو ان کا جواب مختلف ہوتا ہے"۔[٦]

قدماء بھی اسی بات کے قائل تھے۔ مثلاً عبد القاہر جرجانی کا خیال ہے کہ بلاغت کا ادراک ذوق اور احساس کی بنیاد پر ہوتا ہے اور اس کا حصول انتہائی مشکل ہے۔ انھوں نے لکھا ہے: "یہ مرض معمولی نہیں ہے اور نہ اس قبیل سے ہے کہ جب اس کے علاج کا قصد کیا جائے تو ہر ایک کے معاملے میں اس میں کام یابی ملے اور کوشش نفع بخش ثابت ہو۔ اس لیے کہ وہ خصائص، جن کے مقامات واحوال سکھانے اور بیان کرنے کی ضررت پیش آتی ہے، چند ایسے پوشیدہ امور اور روحانی معانی ہیں جن کی طرف سامع کی توجہ مبذول نہیں کرائی جا سکتی اور جاننے کے باوجود اسے بیان نہیں کیا جاسکتا۔ یہاں تک کہ سامع خود اس کے ادراک کے لیے تیار ہو، اس کے اندر اس کے قبول کرنے کا مزاج ہو۔ اور ساتھ ہی وہ حساس اور باشعور ذوق اور طبیعت کا مالک ہو"۔[٧]

مولانا فراہی سے ہی ملتا جلتا قول سکاکی کا بھی ہے۔ وہ اعجازِ قرآن سے متعلق گفتگو کرتے ہوئے رقم طراز ہیں: "یہ بات پیش نظر رہے کہ اعجازِ قرآن کا معاملہ بھی عجیب وغریب ہے۔ اس کا ادراک تو ہوتا ہے، لیکن اسے بیان کرنا ممکن نہیں ہے۔ جیسے وزن کے درست ہونے کا ادراک ہو جاتا ہے، لیکن اسے بیان نہیں کیا جاسکتا۔ یہی حال ملاحت (نمکینی) کا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اعجاز کا ادراک صرف اور صرف ذوق سے ہوسکتا ہے اور ذوق کے حصول کا راستہ ان دونوں علوم — معانی وبیان — سے طویل اشتغال ہے"۔[٨]

مولانا فراہی نے ان اہل بلاغت پر نقد کیا ہے جنہوں نے عجمیوں کی راہ اختیار کی ہے۔ لکھتے ہیں: ''اگر ان لوگوں نے کلامِ عرب کا استقصاء کیا ہوتا، اس کے محاسن تلاش کیے ہوتے اور ان کے حدود مقرر کیے ہوتے اور ایک خاص ترتیب سے انھیں منظم کیا ہوتا، یہاں تک کہ انھیں محاسنِ کلام کی معرفت کے لیے کسوٹی اور پیمانہ حاصل ہو جاتا، اس کے بعد وہ قرآن کریم کے انوکھے پن اور اس کے حیرت انگیز نظم کے بارے میں غور وفکر کرتے تو وہ اعجازِ قرآن کی معرفت سے زیادہ قریب ہوتے۔ لیکن انہوں نے کلامِ عرب کو پیمانہ نہیں بنایا، بلکہ عجمیوں کے علوم سے متأثر ہو گئے اور عجمی عادات واطواران میں سرایت کرگئیں۔ اس سے جاحظ کا استثناء ہے کہ وہ عربوں کے طریقۂ کار سے اتنا دور نہیں ہے جتنا کہ دلائل الاعجاز کے مصنف (جرجانی) دور نکل گئے۔ مؤخر الذکر کا یہ بُعد خالص کلامِ عرب کی قلّتِ ممارست کا نتیجہ ہے۔ اگر انہیں یہ چیز میسر ہوتی تو اس فن میں ان کے مقام ومرتبہ سے آشنا ہوتے اور مولّدین پر ان کے فضل کا انہیں اعتراف ہوتا۔ جاحظ نے تو یہ کہا ہے: ''سلف کے خطبات اور خالص عرب کے کلام میں مجھے منخول الفاظ، دخیل معانی، سطحی کلام اور ناپسندیدہ اقوال نظر نہیں آئے۔ یہ چیزیں ہمیں تکلف پسند شہری مولّدین اور اہل تصنع ادباء کے یہاں کثرت سے ملتی ہیں۔ خواہ یہ ارتجالاً اور بداہتہً ہوں یا غور وفکر اور توقف کے نتیجے میں''۔ چناں چہ جب انہوں نے عربوں کے طریقۂ کلام کو پس پشت ڈال دیا تو بدیع ان کے نزدیک سب سے اہم شئ کا درجہ اختیار کرگئی اور تشبیہ ان کا مطمح نظر بن گئی، جب کہ سلف کے یہاں اول کی حیثیت ناپسندیدہ شی کی اور ثانی کی حیثیت غیر اہم شی کی تھی''۔[۹]

عبدالقاہر جرجانی کی بلاغت کو عجمی بلاغت قرار دینا مولانا فراہی کی زیادتی ہے۔ ان کی بلاغت تو درحقیقت قرآنی بلاغت ہے۔ جرجانی کلام عرب کے نحو و اسلوب سے ناواقف نہیں تھے، بلکہ نحوی کی حیثیت سے انہوں نے بلاغت قرآنی، نحو، صرف، عروض اور دیگر موضوعات پر بہت سی کتابیں تصنیف کی ہیں۔[۱۰]

مولانا فراہی کا یہ موقف اس چیز کے بارے میں ہے جسے انھوں نے عجمی

بلاغت قرار دیا ہے۔ اب عربوں کی بلاغت کے باب میں ان کا موقف ملاحظہ کیجیے:

''اس بات کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ ایسا نہیں ہے کہ عربوں کو بلاغت تو عطا ہوئی، لیکن کلام کے محاسن اور خامیوں کے مابین تمیز کی صلاحیت سے انہیں محروم کر دیا گیا کہ کلام میں حسن وقبح کے موقع ومحل سے وہ نا آشنا رہیں، بلکہ وہ کلام کی عمدگی پر فخر و مباہات کیا کرتے تھے اور اپنے درمیان اس شخص کو حَکَم قرار دیتے تھے جو سب سے زیادہ تنقیدی بصیرت کا حامل ہو''۔ ۱۱؎

آگے لکھتے ہیں: ''کلام پر نقد کے سلسلہ میں ان کا طریقۂ کار صاحب اسرار البلاغۃ (جرجانی) کے طریقۂ کار سے بالکل مختلف تھا۔ لیکن جرجانی کا منہج اپنے بعد آنے والوں کے لیے نمونہ بن گیا۔ لوگوں نے انہی کی اتباع کی۔ چنانچہ ان کا طریقہ ان کے اور عربوں کے درمیان رکاوٹ بن گیا۔ اگر ان کے یہاں کلام عرب کا التزام پایا جاتا اور بعد والوں کے متعین کردہ اصول کی طرف ان کی توجہ نہ ہوتی تو وہ ان کے حق میں بہتر ہوتا اور فن کی بہ نسبت ذوق کی راہ سے اعجازِ قرآن کی معرفت ان کے لیے زیادہ آسان ہوتی''۔ ۱۲؎

اس کے بعد انھوں نے ارسطو کے بیان کردہ نظریۂ محاکاۃ پر تنقید کی ہے۔ لکھتے ہیں: ''اگر جرجانی کا خیال یہ ہوتا کہ شعر بلکہ ہر کلام اور موسیقی کی اعلیٰ قسم تصویر ہے تو یہ بات زیادہ درست ہوتی۔ اس لیے کہ محاکاۃ اور تصویر کے درمیان بہت معمولی فرق ہے، لیکن شعر کی غایت، اس کے مضمون اور اس کے آغاز کی بابت اس کی خطا نے اسے راہ راست سے بہت دور کر دیا۔ اس خطا کا بنیادی سبب اس کی قوم کا کلام اور ان کے یہاں اس کا استعمال ہے۔ اگر اس نے فلسفیانہ انداز میں شعر سے متعلق بحث وتحقیق کی ہوتی اور اس میں ان علل واسباب کے نقطۂ نظر سے غور کیا ہوتا جن پر مابعد الطبیعی امور میں اس نے زور دیا ہے اور جس کے سلسلے میں اس نے قدیم حکماء کا رد کیا ہے تو اتنے قریب آجانے کے بعد صحیح بات اس کی نگاہوں سے اوجھل نہ ہوتی اور غایت شعر اس سے مخفی نہ رہتا''۔ ۱۳؎ اس کی وجہ یہ ہے کہ ارسطو کے

نزدیک غایتِ شعر کبھی اثر انگیزی اور فرحت و شادمانی کی کیفیت پیدا کرنا ہے اور کبھی اس سے مقصود قصہ ہے اور غالباً اس کا سبب یہ ہے کہ ''شعر کے موضوع پر اس کی تصنیف اس کی حکمت کی پختگی کا آغاز ہے''۔ [۱۴]

مولانا فراہی کے خیال میں زیادہ بہتر تھا کہ اس کے باطل سے روگردانی اختیار کی جاتی۔ کاش مسلم علماء نے بلاغت کے موضوع پر تصنیف کرتے وقت اس کے متعین کردہ خطوط کو تسلیم نہ کرلیا ہوتا۔ اگر اس نے کلامِ عرب کا عمیق جائزہ لیا ہوتا تو حقیقت بالکل واضح ہوجاتی۔ لیکن ''اس نے اپنی قوم کے کلام کو پیش نظر رکھا اور اس نے ان کے بہتر کلام میں جو کچھ پایا اسی پر فن نقد الشعر کی اساس قائم کردی، جہاں شعر کی حیثیت قصص اور جھوٹے واقعات کی تھی، جیسا کہ ہومرس، سوفاکلیس اور دیگر شعراء کی نظموں میں نظر آتا ہے۔ چنانچہ اصولِ نقد اور محاسن کے دائرہ کار کے استنباط کے لیے اس نے اس میں غور وفکر کیا اور یہی طریقہ ہے کہ محاسن کا وجود پہلے ہوتا ہے اور اربابِ نظر اس سے اصول کا استنباط بعد میں کرتے ہیں، یعنی بلاغت ونقد کے اصول اس کلام سے مستنبط کیے جاتے ہیں جو زیرِ مطالعہ ہوتا ہے، نہ کہ کسی دوسری زبان کے کلام سے۔ اسی چیز نے ارسطو کو ان اصول کے استنباط پر آمادہ کیا، اس لیے کہ اس نے دیکھا کہ اہل یونان کے یہاں کلام مستحسن کی سب سے نمایاں صفت یہ ہے کہ وہ قصہ یا واقعات کی حکایت ہو، اس کی طرف وہ دو وجوہ سے آمادہ ہوا:

(۱) انسان بالطبع دوسرے جان دار کی بہ نسبت زیادہ حکایت کرنے والا ہے۔ یہ صفت اس کی فطرت سے زیادہ قریب اور اس کے نزدیک زیادہ محبوب ہے۔

(۲) علم طبعاً پسندیدہ شئ ہے اور کسی شئ کی حکایت اس کی خبر دیتی ہے جس کی حکایت کی گئی ہے۔ اس لیے وہ بھی پسندیدہ ہے۔

اسی وجہ سے ارسطو نے محاکاۃ کا نظریہ اختیار کیا اور اس پر شدت سے قائم رہا اور ہر اس شخص کی بات رد کردی جس نے اس کے خلاف رائے دی۔ چوں کہ اہلِ یونان کے بیش تر اشعار ''قصہ گوئی کی محفلوں اور لہو ولعب کی مجلسوں میں طربیہ اور

رزمیہ واقعات سے تلذّذ پر مبنی ہیں، اس لیے عمدہ اشعار کا مقصد سوائے طرب و شادمانی کے اسے کچھ اور نہیں نظر آیا۔ ارسطو کا خیال ہے کہ "اگر صداقت اور راست گوئی طرب انگیز نہ ہو تو شاعر کو اس میں کچھ کمی بیشی کر دینی چاہیے۔ اس کی یہ رائے اپنی قوم میں انفرادی نوعیت کی نہیں ہے، بلکہ پوری قوم کا یہی خیال ہے۔ اس لیے کہ شاعر کی حیثیت ان کے نزدیک ایسے قصہ گو کی ہے جو سامعین کو خوش کرنے کے لیے حکایات و واقعات کو گھڑ کر پیش کرتا ہے"۔ ۱۵؎

جب عرب اہلِ بلاغت نے دیکھا کہ ارسطو کے یہاں اس فن کی اساس قصہ گوئی کی مہارت پر قائم ہے" تو بعض لوگوں کے ذہن میں یہ بات راسخ ہو گئی کہ سب سے عمدہ شعر وہ ہے جو سب سے زیادہ جھوٹ پر مبنی ہو اور چوں کہ عربوں کی شاعری میں تشبیہ کے علاوہ قصہ اور حکایت جیسی کوئی چیز نہیں تھی تو یہ سمجھا جانے لگا کہ تشبیہ میں غلو کا تعلق شعر کے محاسن سے ہے اور جس طرح ارسطو کے یہاں نظریۂ محاکاۃ کو ترجیح حاصل ہے اسی طرح تشبیہ و تمثیل کو، جو قصہ کے مشابہ ہے، عربوں کے نزدیک بلاغت کے محور کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ اس کے بعد انھوں نے اس رائے کے سلسلے میں ارسطو سے اتفاق کیا، جس نے حسنِ کلام کی تعریف یوں کی ہے: "بلیغ کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ اسے تشبیہ کے استعمال میں مہارت حاصل ہو"۔ جرجانی کا قول ہے: "اگرچہ ہم کُل کا دعویٰ نہیں کرتے، لیکن کلام کی بیش تر خوبیوں سے ہی تشبیہ کی مختلف انواع پھوٹی ہیں اور انہی پر ان کا اختتام بھی ہوتا ہے۔" اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ "مولّدین (تکلّف پسند شعرائ) نے اپنی ساری توجہ اسی پر مرکوز کر دی۔ اس کے نتیجے میں عربوں کے کلام میں جو سحر انگیزی اور اعجاز تھا وہ رخصت ہو گیا اور انھوں نے استعارہ کو اسی نقطۂ نظر سے دیکھا کہ وہ تشبیہ میں مبالغہ کا دوسرا نام ہے۔ چنانچہ ان کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی کہ کلام میں جھوٹ سے حسن پیدا ہوتا ہے"۔ ۱۶؎

مولانا فراہی نے اس پر یہ استدراک کیا ہے: "تشبیہ اور اس کی انواع میں جو خوبیاں ہیں، ہمیں ان سے انکار نہیں، لیکن ہم اسے ایک ایسی اصل کی فرع قرار

دیتے ہیں جو تشبیہ کے علاوہ ہے اور اس کی اساس ارسطو اور اس جیسے دوسرے لوگوں کے خیال کے برعکس صدق پر قائم ہے''۔ اس استدراک میں مولانا فراہی بہت دور نکل گئے ہیں، اس لیے کہ عربوں نے تشبیہ واستعارہ کا مفہوم ارسطو کے بیان کردہ نظریۂ محاکاۃ سے نہیں اخذ کیا ہے، کیوں کہ کلامِ عرب میں ان دونوں چیزوں کی اہمیت معروف تھی، بالخصوص تشبیہ کی۔ اس کے متعلق مبرد کا خیال ہے: ''کلامِ عرب میں تشبیہ کا استعمال عام ہے، یہاں تک کہ اگر کوئی یہ کہے کہ ان کا بیش تر کلام تشبیہ پر مبنی ہے تو مبالغہ نہ ہوگا۔'' ۱۷؎ مبرد نے اپنی کتاب تشبیہ سے متعلق تفصیلی گفتگو کی ہے اور جابجا اس کی مختلف انواع بیان کی ہیں اور اس کے حسن وقبح کی طرف اشارے کیے ہیں۔ ۱۸؎ یہی حال استعارہ کا بھی ہے، جو عربوں کے شعور سے کوئی بعید شی نہیں تھی، بلکہ تصور وخیال کی غرابت اور اس میں جدّت اور انوکھا پن اشعارِ عرب کے محاسن میں شمار کیا جاتا تھا۔ کیا بلاغت کے موضوع پر عربوں کی تالیفات اور ارسطو کی کتب 'شعر' اور 'خطابۃ' سے آگاہی سے قبل حضرت حسان بن ثابتؓ نے تشبیہ کے باب میں اپنے بیٹے کی عبارت کو بنظر استحسان نہیں دیکھا تھا؟ ان کے بیٹے عبدالرحمٰن ان کے پاس روتے ہوئے آئے اور عرض کیا: 'مجھے ایک پرندے نے ڈس لیا ہے'۔ حسانؓ نے کہا: اس کا وصف بیان کرو۔ اس نے کہا: ''ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ دو ریشمی چادروں میں لپٹا ہوا ہے''۔ دراصل اسے بھڑ نے ڈنک مار دیا تھا۔ یہ سن کر حسانؓ نے کہا: ''ربِ کعبہ کی قسم، میرے بیٹے نے تو شعر کہہ دیا ہے''۔ کیا اس واقعے میں شعر کہنے اور اس کی منظر کشی کے لیے ژرف نگاہی اور استعداد کی دلیل نہیں ہے؟ تصویر کشی میں غلو قدیم عربی شاعری میں معروف طریقہ تھا۔ خیال کی منظر کشی انوکھی بات نہیں تھی اور نہ وہ جھوٹ تھا۔ اگرچہ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ حقیقت کو جوں کا توں پیش کرنا چاہیے۔ ان کے مطابق سب سے عمدہ شعر وہ ہے جو سب سے زیادہ سچا ہو۔

مولانا فراہی ازسرنو نظریۂ محاکاۃ کو موضوع بناتے ہیں اور اس کا سبب نطق کو قرار دیتے ہیں۔ اس لیے کہ ''انسان فطری طور پر حیوانِ ناطق ہے، اسی لیے نطق ہی

اس کے لیے فیصلہ کن اساس ہے، نہ کہ محاکاۃ، جیسا کہ ارسطو کا نظریہ ہے"۔۱۹؎ کتاب کے شروع میں وہ بیان کر چکے تھے کہ: "بیان کی حیثیت سایے کی سی ہے اور گویائی میں جو اثر ہے اس کی حیثیت انسان کے لیے اساس کی ہے"۔ اور "گویائی انسان کی فطرت میں ودیعت ہے اور ہر قوت عمل کے لیے وسیلہ تلاش کرتی ہے"۔ مولانا فراہی محاکاۃ کے سلسلے میں اپنے فہم اور رائے پر زور دیتے ہوئے تفصیل سے اس کی وضاحت کرتے ہیں اور بیان کو نطق سے مربوط کرتے ہیں، "جس کی حیثیت ایک ایسے پھول کی ہے جو کمالِ فہم اور ڈھانچہ کی درستی سے پیدا ہوتا ہے"۔ اگر انسان میں نطق کی صلاحیت نہ ہوتی تو محاکاۃ اس کے بس میں نہ ہوتا۔ قوتِ گویائی (نطق) ہی مؤثر سبب ہے۔ جہاں تک الفاظ و معانی کا تعلق ہے تو ان کی حیثیت مادہ کی ہے۔ نطق معانی کو الفاظ کا قالب عطا کرتا ہے، خواہ اس نے اسے خود ایجاد کیا ہو یا اس کا تعلق کسی ایسی شی سے ہو جسے انسان نے محاکاۃ کے توسط سے سیکھا ہو۔

ارسطو اور مسلم فلاسفہ و معاصرین کے نظریۂ محاکاۃ سے متعلق مولانا فراہی کا یہی موقف ہے۔ ان کی اس رائے کا ماخذ کلام کے اس فہم سے ہے جسے وہ واقعہ کی حکایت یا تقلید نہیں سمجھتے ہیں، تاکہ اچھی اور بری چیزوں کو اخذ نہ کیا جائے۔ یہ ایسی چیز ہے جسے کوئی بھی ایسا شخص تسلیم نہیں کرسکتا جو کلام کو عموماً اور شعر کو خصوصاً اخلاق سے مربوط کرتا ہو۔ اس کی وضاحت ان کے اس قول سے ہوتی ہے: "یہ بات ذہن میں رہے کہ بلاغت کا حسن و کمال ان صور و معانی کے حسن پر موقوف ہوتا ہے جو اس تک پہنچتی ہیں۔ اس کا لحاظ رکھنا زیادہ موزوں ہے۔ ہمارے نزدیک اس کلام کی کوئی حیثیت نہیں جس نے کسی حقیر شخص کی خبیث شئ کو کمالِ صحت کے ساتھ ادا کیا ہو۔ اس طرح کے نطق سے خاموشی ہی بہتر ہے۔ یہ ایسی رائے ہے جس کی صحت کے لیے بیان (تفصیل) کی ضرورت ہے۔ ابوجعفر قدامہ، جنھیں اس فن کے امام کی حیثیت حاصل ہے، انھوں نے اپنی کتاب 'نقد الشعر' میں ایک ایسی بات کہی ہے جس سے نوآموز راہِ راست کا سرا کھو دیتا ہے، اگرچہ اس کا مفہوم صحیح ہے۔ انھوں نے لکھا ہے: "معنی

کا خراب ہونا بذات خود ایسی چیز نہیں ہے جس سے شعر کی عمدگی ختم ہو جاتی ہے، جس طرح کہ لکڑی کے خراب ہونے سے بڑھئی کی مہارت میں کوئی عیب واقع نہیں ہوتا۔ آگے مزید لکھا ہے: ''شاعر کے لیے ضروری نہیں ہے کہ وہ سچا ہو، بلکہ اس سے مطلوب یہ ہے کہ جب وہ کسی معنی ومفہوم کو اختیار کرے، خواہ اس کی نوعیت کچھ بھی ہو، تو اسے عمدگی کے ساتھ پیش کرے''۔اسی طرح شعر سے ان کا مقصود ایک کم ترشی اور ایک حقیر فن ہے ۔۔۔ہم کلام کے محاسن اس کے شایانِ شان چاہتے ہیں جس طرح سے کہ فطرتِ انسانی نے اسے وضع کیا ہے اور جو قوتِ نطق کے کمال کا تقاضا ہے اور جدید شاعر وخطیب اسی نام سے اس کا استعمال کرتا ہے۔۲۰؎

مولانا فراہی کے نزدیک شعر کلام ہی کی ایک قسم ہے: ''کلام صرف آواز (جرس) کا نام نہیں ہے، بلکہ وہ مفہوم اور آواز سے مرکب ایک شئ ہے اور شئ مرکب میں اصل امر کا لحاظ رکھتے ہوئے اس کے حسن کا فیصلہ کیا جاتا ہے''۔یعنی غور وفکر کلی طور پر ہونا چاہئے اور کلام کے سلسلے میں مجموعی طور پر فیصلہ کیا جانا چاہیے۔اگر اس کے کسی ایک پہلو میں خلل واقع ہو یا اس کا کوئی رکن ساقط ہو جائے تو کلام میں حسن پیدا نہیں ہوسکتا۔اس کی ایک مثال بیان کرتے ہوئے مولانا لکھتے ہیں: ''ایک کور چشم بھینگی آنکھ والے شخص کو، جس کی دوسری آنکھ صحیح سالم اور خوب صورت ہو، حسین نہیں کہا جا سکتا۔بعینہ یہی معاملہ حسنِ کلام کے سلسلے میں بھی ہے، البتہ تم یہ کہہ سکتے ہو کہ اس شعر کا وزن یا اس کی آواز اچھی ہے، پھر ہم اس رائے کی تائید کسی ایسے امر سے کر سکتے ہیں جو ابلاغ کے لحاظ سے کلام سے قریب تر ہو۔کوئی کلام کسی عقل مند کے دل تک اسی صورت میں رسائی حاصل کر سکتا ہے جب اس کا مفہوم عمدہ ہو۔احمق اور بد قماش لوگوں کا اس کلام سے متأثر ہو جانا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ہم درحقیقت سلامتِ حال کا لحاظ رکھتے ہوئے ہی اشیاء کو نام عطا کرتے ہیں، ورنہ بہ یک وقت کلام کو حسین اور قبیح قرار دینا لازم آئے گا، یا اسے کوئی نام ہی نہیں دیا جا سکے گا۔جب ہم دلوں میں معانی ومفاہیم کی اثر انگیزی کے اسباب تلاش کرتے ہیں تو اس وقت یہ

معاملہ مزید آشکارا ہوجاتا ہے ۔ چنانچہ الفاظ کو کبھی ان کے عام اور صحیح قواعد سے پھیر دیا جاتا ہے اس معنی و مفہوم کی ادائی کے لیے جو نفس میں زیادہ مؤثر ہوتا ہے اور وہ الفاظ کو اپنے لیے حجاب اور اپنے اوپر بوجھ محسوس کرتا ہے، جس طرح سے کہ بادشاہ اپنے لیے سفیر مقرر کرتا ہے ۔ معلوم ہوا کہ بلیغ دراصل معنیٰ ہوتا ہے اور لفظ اس کی سواری ہوتا ہے۔ اس بنا پر کلام کے حسن کے سلسلے میں معنیٰ کا لحاظ زیادہ موزوں ہے۔ یہ دو دلیلیں ہیں ۔ تیسری دلیل سے اس کی مزید تائید فراہم کی جائے گی اور وہ یہ کہ عربوں نے کلام کو پسند ہی اس لیے کیا کہ اس کے معنیٰ و مفہوم میں حسن ہوتا ہے ۔ انھیں اس قول سے کوئی دلچسپی نہیں رہی ہے جو برے مفہوم پر مشتمل ہو۔ ایسے کلام کی وہ لوگ مذمت کرتے ہیں اور اسے حقیر گردانتے ہیں''۔ ۲۱ ؎

اس کے بعد مولانا نے زہیر بن ابی سلمی کے چند اشعار ذکر کیے ہیں اور ان کے بارے میں اپنی پسندیدگی کا اظہار کرنے کے بعد لکھا ہے: ''اس سے واضح ہوجاتا ہے کہ حسنِ کلام حسنِ معنی کے تابع ہے ۔ کلام کو اسی وقت حسین قرار دیا جا سکتا ہے جب اس کا معنیٰ و مفہوم بہتر ہو۔ کلام کو اسی وقت فضیلت حاصل ہوتی ہے جب اسے صحت کے ساتھ ادا کیا جائے ۔ اگر کلام متکلم کے دل سے نکلے تو اس نے اپنا حق ادا کر دیا، لیکن اگر اس کا معنیٰ و مفہوم ایسا نہ ہو جو دل پر اثر کرے تو وہ غیر بلیغ قرار پائے گا ۔ کلامِ عرب میں فحش، گھٹیا اور عامیانہ کلام کی مذمّت اس کثرت سے کی گئی ہے کہ اگر ان کے کسی شعر میں یہ برائیاں پائی جاتی ہیں تو وہ اسے ساقط اور ناقابلِ اعتبار کلام قرار دیتے ہیں ۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ امرؤالقیس کے باپ نے شعر کہنے کی وجہ سے ہی اپنے بیٹے کو قتل کر دینے کا حکم صادر کر دیا تھا اور لوگوں نے اسے 'ضلّیل' کا لقب دیا تھا اور نابغہ ذبیانی کے بادشاہوں کی مدح سرائی کی بنا پر لوگوں نے اس کی مذمت کی تھی ۔ عرب محسن کی مدح سرائی اور احسان ناشناس کی مذمت کرتے ہیں۔ حقیر و ذلیل شخص کی مدح سرائی سے انہیں عار محسوس ہوتی ہے ۔ ۲۲ ؎

مولانا فراہیؒ نے لکھا ہے کہ ان کا یہ کلام انفرادی نوعیت کا نہیں ہے ۔

انھوں نے بطور استدلال جاحظ کے کلام کو پیش کیا ہے جس نے بلاغت کا محور علم کا نور اور قلب کی طہارت کو قرار دیا ہے پھر رقم طراز ہیں: ''کیا ان دونوں کے بغیر کسی کلام کا وجود ممکن ہے؟ اور کیا اس کے بغیر صحیح قول کی طرف رہ نمائی حاصل کی جاسکتی ہے؟

انھوں نے قرآن کریم سے اپنی رائے کی تائید حاصل کی ہے کہ اللہ تعالی نے اپنے کلام کو اس لیے بلیغ قرار دیا ہے کہ وہ دل پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اس کا فرمان ہے: ''**وَقُل لَهُم فِی اَنفُسِهِم قَولاً بَلِیغًا**'' (النساء :۶۳) دوسری جگہ ارشاد ہے: ''**فَلِلّٰهِ الحُجَّةُ البالِغَةُ**'' (الانعام: ۱۴۹)۔ اس سے واضح ہوگیا کہ سب سے بلیغ کلام وہ ہے جس کی اثر انگیزی سب سے زیادہ ہو اور جو سب سے زیادہ قرین عقل ہو۔

مولانا فراہی نے یہ طویل بحث اس مقصد سے کی ہے تا کہ وہ نظریۂ محاکاۃ کے سلسلے میں اپنی رائے واضح کر دیں اور اس سلسلے میں وہ کسی قطعی فیصلہ تک پہنچ جائیں۔ اس کا خلاصہ ان کے الفاظ میں یہ ہے: ''جب یہ واضح ہوگیا کہ حسنِ کلام محض محاکاۃ میں نہیں ہے، بلکہ متکلم کی طرف سے معانی کی صحیح طور پر ادائیگی میں ہے اور کلام کا مقصد محض سامع کو خوش کرنا نہیں ہے، بلکہ اس کی حیثیت عقل کے سچے سفیر کی ہے اور اس سے تلذّذ اس وجہ سے نہیں ہے کہ محاکاۃ انسان کی اصل میں شامل ہے، بلکہ اس وجہ سے ہے کہ اس میں اس کی طاقت کو پرواز عطا کرنے کی صلاحیت ہے اور انسان کی خاصیت محاکاۃ نہیں، بلکہ نطق ہے۔ کوئی بات کہنے والے کے لیے صداقت لازم ہے۔ اگر وہ اپنی بات میں کذب کی آمیزش کر لے تو اپنے مقام سے گر جاتا ہے اور غلط مفہوم اس کے کلام سے بلاغت کی صفت کو ختم کر دیتا ہے۔ ان امور کی وضاحت کے بعد ارسطو اور ہمارے طریقۂ کار میں فرق واضح ہو جاتا ہے''۔

صحتِ معنی، صحتِ قبول، اخلاقی اور عقلی نقطۂ نظر ہی دراصل بلاغت کلام کی اساس ہیں، نہ کہ محاکاۃ، جس کا ارسطو نے آوازہ بلند کیا ہے۔ جہاں تک شعر میں موجود کذب کا تعلق ہے'' تو وہ صرف تمثیل کے مقصد سے ہوتا ہے، اس لیے کہ تمہارے لیے امر مبہم تک رسائی حاصل کرنا اور اسے کوئی شکل اور تشخص عطا کرنا ممکن نہیں۔ اگر

تمہیں اس کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہو تو تم اپنے خیال سے اسے کوئی شکل عطا کردو گے۔ اس سے مقصود صرف تصویر کشی ہوتی ہے۔ امثال اور جانوروں کی حکایات سے اصلاً یہی مقصود ہوتا ہے اور وہ تشبیہ کے مثل ہے۔ جہاں تک تشبیہ اور غیر تشبیہ میں کذب کی حد تک مبالغہ آرائی کا تعلق ہے تو یہ بات ذہن میں رہے کہ شاعر صرف اپنے بارے میں آگاہی دیتا ہے''۔ آگے لکھتے ہیں: ''اگر مبالغہ میں کذب اس حد سے (یعنی شدتِ احساس کی حد سے) متجاوز نہ ہو تو وہ عین صدق ہے۔ جو شخص اس امر سے ناواقف ہو اس کے لیے احساس اور افتراء میں فرق کرنا مشکل ہوگا۔ پس وہ کذب کو شعر کا جزء سمجھ لے گا، حالاں کہ شعر کی اساس صدق پر قائم ہوتی ہے۔''[۲۴]

پھر مولانا فراہی نے شعر اور خطابت میں فرق بیان کیا ہے۔ انھوں نے ارسطو کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ''شعر لوگوں کے اچھے اور برے کاموں کو نقل کرنے کا نام ہے''۔ اس لحاظ سے مولانا فراہی دونوں میں کوئی فرق نہیں کرتے، اس لیے کہ بلاغت میں شعر اور خطابت دونوں شریک ہیں۔ ان کے نزدیک شعر اور غیر شعر میں صرف وزن اور قافیہ کا ہی فرق نہیں ہے، بلکہ شعر کے چند اور اوصاف بھی ہیں۔ جس طرح ہر وہ شخص خطیب نہیں ہے جو 'اما بعد' کہے۔ دونوں کے درمیان فرق یہ ہے کہ شاعر ایک چیز کو محسوس کرتا ہے، چنانچہ اسے بیان کرنے کے لیے اس کے اندر ہیجان پیدا ہوتا ہے اور وہ بیان کر دیتا ہے۔ اس کا ہیجان صرف اس وجہ سے ہوتا ہے کہ اس کا شعور (یعنی قوتِ احساس) اوروں کی بہ نسبت زیادہ ہوتا ہے۔ یہ شعور اس کے اندر اثر انداز ہو کر اس کی قوتِ تخیل، گویائی اور غنائیت کو مہمیز کرتا ہے، اس کے نتیجے میں یہ طاقتیں اس کے اندر بیدار ہو جاتی ہیں، اس کے افکار و خیالات میں یہ احساس سرایت کر جاتا ہے، جس کے نتیجہ میں اس کے اندروں سے اشعار نکلنے لگتے ہیں۔

خطیب بھی اپنے احساس کے لحاظ سے شاعر کے ہم مثل ہوتا ہے، البتہ وہ اس اعتبار سے اس سے جدا ہوتا ہے کہ اسے اپنے شعور پر غلبہ حاصل ہوتا ہے۔ اس کی حالت سینے کے مرض میں مبتلا شخص کی سی نہیں ہوتی، بلکہ وہ اپنے اوپر قابو رکھتا ہے اور

سامعین میں ڈوب جاتا ہے۔ اس کا اصل مقصود دوسروں کو متأثر کرنا ہوتا ہے، جس طرح کہ شاعر کا اصل مقصود اس کی ذات پر اثر انداز ہونے والی قوتوں کی تابع داری ہوتی ہے۔خطیب جوش و جذبہ اور احساس کی فراوانی میں شاعر کے مثل ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ اس کے اندر ایک اضافی صفت بھی پائی جاتی ہے جو اسے اس نام کا مستحق بناتی ہے۔ شاعر کے پیشِ نظر ماضی ہوتا ہے، جب کہ خطیب مستقبل کو سامنے رکھتا ہے۔ بلند ترین مقصد کی وجہ سے خطیب کا مقام اعلیٰ، اس کی عقل پختہ، اس کی قوت شدید اور اس کا نفس انتہائی پاکیزہ ہوتا ہے، جب کہ شاعر بھرپور مزاج اور لطیف احساسات کا مالک ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے اہل عرب خطبہ کو حکمت، بیان اور فصل سے تعبیر کرتے ہیں، جب کہ شعر کو سحر قرار دیتے ہیں۔

شعر کی ایک نمایاں خصوصیت وزن ہے۔ اس کا وہ جزء جو روح کے چشموں سے پھوٹتا ہے، اشتعال میں نفس کے مشابہ ہے۔ اسی کو شعر کہتے ہیں، نہ کہ ہر وہ کلام جسے مجاز اور تشبیہ نے آراستہ کیا ہو، اس لیے کہ نثری کلام میں اس طرح کی بہت سی چیزیں پائی جاتی ہیں۔ درحقیقت شاعر کسی چیز سے متأثر ہوتا ہے تو وزن، نغمہ اور رقص اس کے اندر جوش کی کیفیت پیدا کرتے ہیں۔ ہر شاعر کے اندر اس طرح کے احساسات موجود ہوتے ہیں''۔ مولانا فراہی نے ان چیزوں (عروض، نغمہ اور رقص) کو ایک ہی لڑی میں پرو دیا ہے، اس لیے کہ حقیقت میں وہ اسی طرح ہیں، جب کہ اس کی حقیقت ارسطو کی نگاہوں سے اوجھل رہی، کیوں کہ وہ شاعر نہیں تھا۔ چناں چہ جس چیز کا اسے ذوق نہیں تھا اسے وہ جان نہ سکا۔ اس نے یہ سمجھ لیا کہ شعر کی طرح نغمہ اور رقص کا تعلق بھی محاکاۃ سے ہے، اس لیے کہ ان سے اندرونی کیفیات، حالات اور وارداتِ قلبی کا اظہار ہوتا ہے۔ اس نے یہ بات درحقیقت اس وجہ سے کہی کہ اس نے مغنیوں اور رقص کرنے والوں کو دیکھا کہ وہ نغمہ (کی آواز) اور رقص (کے اشارے) کے ذریعہ نفس کے حالات اور لوگوں کے افعال کو ظاہر کرتے ہیں۔ اس معاملے میں اگر وہ غور وفکر کرتا یا اسے شاعر کا سا وجدان حاصل ہوتا تو اسے معلوم

ہو جاتا کہ ان امور کا استعمال محاکاۃ اور اظہار کے لیے صرف اس وجہ سے کیا گیا ہے کہ ان کا تعلق اندرونی کیفیات سے ہے۔ مثلاً کراہنے سے غم اور مسکراہٹ سے خوشی کا اظہار اسی وجہ سے ہوتا ہے کہ نفس ان اشارات کو سمجھتا ہے۔''۲۵ ۔ یہ اشارات اسی طرح فطری ہیں جس طرح نطق فطری ہے، اس کا محاکاۃ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

اگر مولانا فراہی شاعر نہ ہوتے تو شعر سے متعلق اس طرح کی گفتگو ان کے لیے ممکن نہ ہوتی جس کا ادراک صرف شعراء ہی کر سکتے ہیں، یا اس کا ان لوگوں کو کچھ احساس ہو سکتا ہے جنہیں اعلیٰ ذوق اور لطیف احساس حاصل ہوتا ہے، جیسا کہ مولانا فراہی کا معاملہ تھا۔ انھوں نے سولہ سال کی عمر میں شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ اس عمر میں انھوں نے خاقانی الشروانی (جو حسان العجم کے نام سے معروف ہیں) کے قصیدہ سے معارضہ کیا تھا، جب کہ اس قصیدہ کا ردیف بہت مشکل ہے۔ ۱۹۰۳ء میں ان کا فارسی دیوان طبع ہو چکا تھا۔ ان کا ایک دوسرا دیوان بھی ہے جس میں انہوں نے صحیفۂ امثال سلیمانی کو فارسی کا قالب عطا کیا ہے اور جو ان کی حیات ہی میں حیدرآباد سے 'خرد نامہ' کے عنوان سے چھپ چکا تھا۔ ان کا عربی زبان میں بھی ایک دیوان ہے جو ۱۳۸۷ھ میں زیور طبع سے آراستہ ہوا ہے۔۲۶ ۔

ان کی شاعری نے انہیں اس بات کا اہل بنادیا کہ وہ شعر اور خطبہ کے درمیان فرق کو محسوس کرسکیں اور انگریزی زبان سے واقفیت نے انھیں مغربی سرمایہ سے استفادہ کا موقع فراہم کیا۔ انھوں نے انگریزی میں عقیدۂ شفاعت اور کفارہ کے موضوع پر ایک رسالہ تالیف کیا تھا جس میں بعض علمائے نصاریٰ کی آراء کا رد کیا تھا۔۲۷ ۔

کلام کے سلسلے میں مولانا فراہی نے اپنی آراء پیش کرتے ہوئے شعر اور نثر بلیغ کے درمیان فرق کیا ہے۔ انھوں نے اس بات کا ذکر کیا ہے کہ ''ان دونوں کے درمیان فرق نہ کرنے کی غلطی سب سے پہلے ارسطو سے ہوئی، پھر مشہور انگریز شاعر 'جان مل' اسی غلطی کا مرتکب ہوا۔ ارسطو کی غلطی زیادہ بڑی ہے، اس لیے کہ اس کا

خیال ہے کہ ’’محاکاۃ کے مختلف طریقے ہیں۔ کلام میں محاکاۃ کے ذرائع تین ہیں: ’’وزن، الفاظ، نغمہ—تینوں الگ الگ بھی پائے جاسکتے ہیں اور ایک ساتھ بھی۔ پھر اس نے گمان کیا کہ محاکاۃ ہی اصلاً شعر ہے اور اعلیٰ ترین امور کی محاکاۃ ہی کو ابوبیہ (Epopee) کہتے ہیں۔ اس کا تذکرہ ہومرس نے کیا ہے۔ اس کا قول ہے کہ ’’ابوبیہ صرف الفاظ کے توسط سے بیان کیا جاتا ہے، جیسے سقراط کا مکالمہ، یا اسے الفاظ کے وسیلہ سے نظم کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے، جیسے نظم فلان وفلان۔ پھر لکھا ہے کہ عموماً وزن شعر کا جز ہوتا ہے، لیکن جن لوگوں نے طب کے موضوع پر منظوم کتابیں لکھی ہیں وہ شاعر کی بہ نسبت طبیب کہلانے کے زیادہ مستحق ہیں۔ اس کی یہ بات صحیح ہے کہ ’’محض وزن سے شعر مکمل نہیں ہوتا، لیکن اس کا سبب یہ نہیں ہے کہ وزن شعر کا جز نہیں ہے، بلکہ اس کا سبب یہ ہے کہ جزء کے وجود سے کل کا وجود لازم نہیں آتا۔ پس اس نے ہومرس اور سقراط کے کلام کو یکساں قرار دے دیا اور دعویٰ کیا کہ وزن کا شعر سے تعلق رواج کی وجہ سے ہے۔ رہا جان مل تو وہ اپنے اس فہم میں کسی حد تک صحیح ہے کہ شعر ایک جوش ہے اور شاعر اپنے آپ کو مخاطب کرتا ہے۔ اس طرح وہ شاعر اور خطیب یا حکیم کے درمیان خلط ملط کرنے سے محفوظ ہو گیا۔ اس بنا پر سقراط کے کلام کو شعر نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن اس (جان مل) کی بات ارسطو کی بہ نسبت زیادہ واضح ہے کہ وزن شعر سے زائد ایک چیز ہے‘‘۔ ۲۸؎

اس کے بعد مولانا فراہی نے دوبارہ شعری خصوصیات سے متعلق گفتگو کی ہے۔ لکھتے ہیں: ’’اندرونی کیفیات کا نفس پر غلبہ ہوتا ہے اور وہ نطق کی راہ سے نکلنا چاہتی ہیں۔ انسان کی غالب صفت نطق ہے۔ جس شخص کو نطق، رقت اور نغمگی کی خصوصیات عطا کی گئی ہوں اسی سے شعر اور نغمہ پھوٹتا ہے اور اگر اس میں اثر انگیزی بھی شامل ہو تو بسا اوقات وہ رقص کرنے لگتا ہے۔ شعر وزن، نغمہ اور رقص سے الگ نہیں ہوسکتا۔ کلام وزن کو برداشت کرلیتا ہے، لہٰذا وہ اس کے ساتھ باقی رہتا ہے۔ نغمہ کلام کے ساتھ کم ہی پایا جاتا ہے اور رقص احساس کی انتہا کا نام ہے، جو انسان کو

اپنے وقار وحشمت سے خارج کر دیتا ہے اور کلام اس کا متحمل نہیں ہوتا۔ پس کلام کی وجہ سے نفس کی حرکات کے آثار بقدر ممکن باقی رہتے ہیں اور جو ممکن نہ ہو اس کو ترک کر دیتے ہیں اور اس کو اختیار نہیں کرتے۔ کمال شئ ایسی چیز نہیں ہے جو ہر حال میں اس کے ساتھ ہو۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ عقل مقوّمات انسانی میں شامل ہے، لیکن اس کا کمال انسان کے لیے لازم نہیں ہے۔ اسی طرح بلاغت نطق کا کمال ہے، لیکن ہر ناطق میں یہ چیز نہیں پائی جاتی۔ اسی طرح نغمہ کا وجود ہر شاعر کے ساتھ نہیں ہے۔ اس کے باوجود شعر مکمل طور پر نغمہ سے خالی بھی نہیں ہوسکتا۔ ہم کسی ایسے شاعر کا تصور نہیں کر سکتے جو گنگناتا نہ ہو۔ عربوں کے یہاں انشاد (ترنم سے پڑھنا) کے علاوہ شعر کا کوئی اور طریقہ معروف نہیں تھا۔ اور وزن نغمہ ہی کا ایک جز ہے''۔ ۲۹؎

مولانا فراہی نے آخر میں یہ نتیجہ پیش کیا ہے: ''پس جس شخص نے گمان کیا کہ سقراط کا مکالمہ شعر کی جنس سے تعلق رکھتا ہے وہ محاکاۃ کے علاوہ شعر کی حقیقت نہیں جان سکا اور جس شخص کے خیال میں وزن کا شعر سے کوئی تعلق نہیں ہے اسے درحقیقت شعر کی اصل کے صرف ایک جز سے آگاہی ہوسکی ہے اور وہ جوش ہے، جو نطق پر آمادہ کرتا ہے۔ شعر اور نثر بلیغ کے درمیان یہی فرق ہے اور ان کا تعلق فطری اور بناوٹی اور دونوں کے درمیان پائے جانے والے اختلاف سے ہے۔ فطری کلام ہی اصل ہے۔ رہا بناوٹی تو فریب دینے والا اور منافق ہے، اس کے کلام میں کوئی روح نہیں پائی جاتی''۔ ۳۰؎

مولانا فراہی بلاغت کے طریقے پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں: ''کلام حقیقت میں ابلاغ کا نام ہے اور یہ اسی وقت پورا ہوسکتا ہے جب کہ وہ اصل اول اور اس چیز کے موافق ہو جو متکلم کے خیال میں ہے۔ اس لحاظ سے اس کی دلالت واضح اور اشارہ درست ہو اور سامع کی حالت کے لحاظ سے مؤثر ہو۔ چاہے وہ نرم اور خوش گوار ہو یا سخت اور کھردرا''۔ ۳۱؎ ان وجوہ کی توضیح کے بعد الفاظ کی جہتِ استعمال سے متعلق گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''عربوں کو اس میدان میں یدِ طولیٰ حاصل

ہے، کیوں کہ ان کے پاس دوسری زبانوں کی بہ نسبت ہر جنس کے لیے الگ الگ بہت سے الفاظ ہیں۔ وہ کسی چیز کی تصویر کشی کرتے ہیں تو اس کی کسی صفت کو بیان کیے بغیر اس کا نقشہ کھینچ کر رکھ دیتے ہیں۔ اس سلسلے میں ان کے مختلف طریقے ہیں: (۱) ایسے اسماء کا وجود جو جنسِ واحد کے مختلف انواع پر دلالت کرتے ہیں۔ (۲) افعال کا وجود۔ (۳) تانیث، تثنیہ، جمع قلّت اور شدت پر دلالت کرنے کے لیے مشتق الفاظ کا وجود''۔ ۳۲؎

مولانا فراہی نے 'آواز' کے تعلق سے بھی گفتگو کی ہے۔ لکھتے ہیں: ''آواز کسی خاص مناسبت کی وجہ سے بعض معانی پر دلالت کرتے ہیں۔ اس کی مثالیں ہر زبان میں ملتی ہیں، البتہ عربی زبان میں اس کے شواہد اتنی کثرت سے ہیں کہ کسی کے لیے ان کا انکار ممکن نہیں ہے۔ تعجب ہے کہ صاحب دلائل الاعجاز (جرجانی) کی نظر سے اتنی واضح حقیقت کیسے اوجھل رہ گئی اور انہوں نے ان علماء کی تردید کردی جنہوں نے آواز کے پہلو سے کلام کی خصوصیت میں لفظ کو ایک مقام دیا ہے''۔ ۳۳؎ ابن جنی نے 'تصاقب الألفاظ لتصاقب المعانی' کے عنوان سے پورا ایک باب قائم کیا ہے اور 'احساس الألفاظ أشباہ المعانی' کے عنوان سے بھی ایک باب ہے۔ ۳۴؎ ضیاء الدین بن الاثیر نے اس سے بحث کی ہے کہ معنیٰ کی قوت کے لیے لفظ کی قوت ضروری ہے۔ ۳۵؎ عبدالقاہر جرجانی الفاظ کے منکر نہیں ہیں، لیکن ان کے نزدیک اعجازِ قرآن کا الفاظ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ انھوں نے لکھا ہے: ''جان لو کہ ہمیں اس بات سے انکار نہیں ہے کہ حروف کے زیروبم اور ان کا ایسی چیزوں سے محفوظ ہونا جو زبان پر گراں گزرتی ہیں، ایسی چیز ہے جو فضیلت کو مستلزم ہے اور اس سے اعجاز کا معاملہ مؤکد ہوتا ہے۔ درحقیقت ہمیں جس بات سے انکار ہے اور جس کے حامل لوگوں کی رائے کو ہم غلط قرار دیتے ہیں وہ یہ ہے کہ وہ تنہا الفاظ کو معجزہ قرار دیتے ہیں اور ان کے نزدیک ان کی حیثیت اصل اور ستون کی ہے۔ اس بنا پر وہ ایسی غلط باتیں کہہ جاتے ہیں جن کو ہم نے بیان کیا ہے''۔ ۳۶؎

اس مسئلہ پر مولانا فراہی نے تفصیل سے اظہار خیال کرنے کے بعد پھر عبدالقاہر جرجانی پر ان الفاظ میں نقد کیا ہے: ''حیرت ہوتی ہے کہ صاحبِ دلائل الاعجاز کیسے اس وہم میں مبتلا ہو گئے اور انھوں نے یہ دعویٰ کیا کہ متکلم کے پیش نظر صرف معنی ومفہوم ہوتا ہے اور اس کے نزدیک خصوصیات کے لحاظ سے الفاظ کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ اس طرح انھوں نے جمہور علماء کے خلاف بات کہی ہے۔''۳۷؎

معانی کے انتخاب کے پہلو پر بھی مولانا نے وضاحت پر روشنی ڈالی ہے۔ انھوں نے لکھا ہے: ''جس طرح اہل عرب معانی کے لیے انہی الفاظ کا انتخاب کرتے تھے جو صحیح طور پر اس کی تصویر کشی کرسکیں اسی طرح وہ الفاظ کے لیے وہی معانی منتخب کرتے تھے جو اس کی صحیح طریقے پر وضاحت کرنے والے اور اس کے ابہام کو دور کرنے کے زیادہ قابل ہوں''۔۳۸؎ انھوں نے اس موضوع کی وضاحت کے لیے کثرت سے اشعار نقل کیے ہیں۔ بحث کا خاتمہ اس پر کیا ہے کہ کس طرح تشبیہ، استعارہ، تمثیل اور مجاز کے ذریعہ کسی چیز کی تصویر کشی کی جاتی ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ ''کسی چیز کی تصویر کشی تشبیہ میں محدود نہیں ہے، بلکہ اس کے متعدد طریقے ہیں۔''۴۱؎ آگے لکھا ہے: ''تمثیل، تشبیہ، استعارہ اور مجاز کے ذریعہ صفت کی وضاحت ہوتی ہے، بغیر اس کے کہ وہ کسی شئ کو کسی دوسری شئ میں تبدیل کردیں۔ مشبہ اور مشبہ بہ کے درمیان فرق کا ہونا ضروری ہے، ورنہ دونوں شئ واحد بن جائیں گی''۔۴۰؎ تشبیہ کی دلالت کو انھوں نے اس انداز میں واضح کیا ہے: ''تشبیہ کا پہلا محرک یہ ہے کہ ناطق کو اپنے ضمیر کے اظہار اور قوتِ نطق کے پرزور استعمال کی خواہش ہوتی ہے، یہاں تک کہ وہ سامع کو اس قابل بنا دیتا ہے کہ گویا اس نے دیکھ لیا ہے اور تجربہ کرلیا ہے۔ اس طرح اس چیز کی وضاحت اور اثر انگیزی میں مزید اضافہ ہوجاتا ہے۔ دوسرا محرک یہ ہے کہ ناطق محض اظہار کے لیے اپنی زبان سے الفاظ ادا نہیں کرتا، بلکہ اس کا مقصد سامع کو متأثر کرنا، اس کے اندر تحریک پیدا کرنا اور محض سماعت کے ذریعہ اس کی محبت یا نفرت حاصل کرنا ہوتا ہے، تاکہ وہ اپنے نادر انداز اور

حسن گویائی سے اپنے آپ کو اور سامعین کو خوش کر سکے اور اس کے ذریعہ شہرت اور دیگر منافع کا حصول ممکن ہو جائے۔ تیسرا محرک یہ ہے کہ وہ تشبیہ کے ذریعہ تقریر یا تحریض تک رسائی حاصل کرتا ہے۔ اس کی دو مختلف جہات ہیں: (۱) مثل اس بات سے زیادہ مشابہ ہے کہ وہ چند دیگر معاملات میں بھی اپنے مثل کی طرح ہو۔ (۲) امر عقلی یا نامعلوم دعویٰ جب محسوس کا پیکر اختیار کر لیتا ہے تو ذہن اس سے جلد متأثر ہوتا ہے۔ اس لیے کہ اس کی فطرت میں یہ بات شامل ہے کہ وہ محسوس اشیاء سے متأثر ہو اور اس کے لیے یہ عام بات ہے، جیسا کہ نظر آتا ہے کہ لوگ جھوٹے واقعات پڑھ کر ہنسنے یا رونے لگتے ہیں اور ان کے اندر رنج یا مسرت کی کیفیت پیدا ہوتی ہیں، حالاں کہ انہیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعات جھوٹے ہیں۔

مولانا فراہی اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ تشبیہ ''توضیح، اعجاب، تقریر اور تاثیر کا نام ہے'' [۴۱]۔ تشبیہ کے ضمن میں گفتگو کرتے ہوئے انہوں نے امام جرجانی پر تنقید کی ہے، ''مولّدین نے دعویٰ کیا ہے کہ تشبیہ میں ندرت اور بُعد اس کے محاسن میں شامل ہے۔ جرجانی نے اس کے اثبات میں بڑی طویل گفتگو کی ہے اور غیر معیاری تشبیہات کو جمع کر دیا ہے۔ ان میں سے چند مثالیں یہاں غور و فکر کے لیے پیش کی جاتی ہیں، تا کہ ان کی سطحیت پوری طرح واضح ہو جائے۔'' [۴۲]۔ آگے انھوں نے **'المذهب الباطل فی التشبیه'** کے نام سے ایک فصل قائم کی ہے، لیکن اس میں ان مثالوں کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے۔

مولانا فراہی کا جرجانی پر نقد درست نہیں ہے، اس لیے کہ امام جرجانی نے جو تشبیہات ذکر کی ہیں وہ انتہائی شان دار ہیں۔ انہوں نے جس انداز سے ان کا تجزیہ کیا ہے اس سے ان کے جمال و بیان میں مزید اضافہ ہو گیا ہے۔ [۴۳]۔

مولانا فراہی کے نزدیک بلاغت کے اصول یہ ہیں کہ کلام کی مفہوم سے مطابقت ہو، کلام بالکل واضح ہو، زائد چیزیں نہ ہوں، وضاحت کے اعتبار سے اس میں حسنِ ترتیب، مقابلہ، تشبیہ اور تمثیل ہو۔ مطابقت کے لحاظ سے لفظ صاف ستھرا ہو۔

یہ وہ موضوعات ہیں جنہیں قدیم اہل بلاغت نے بھی اپنی تحقیق کا موضوع بنایا ہے۔ اس کے بعد مولانا فراہی نے اعتدال، کلام کی مفہوم سے مطابقت، کلام میں سادہ پن، ترتیب، مقابلہ، معانی میں تمییز اور ان کے درجات میں فرق، الفاظ کی تنقیح، ایجاز، اصول ایجاز واطناب، ذخیرۂ الفاظ واسالیب، سرچشمۂ کلام وغیرہ پر گفتگو کی ہے۔ یہاں کتاب کا پہلا حصہ اختتام کو پہنچتا ہے۔

کتاب کے دوسرے حصے کو مولانا فراہی نے 'قسم خصوصی' کا عنوان دیا ہے، لیکن انھوں نے یہ وضاحت نہیں کی ہے کہ یہ عنوان انھوں نے کیوں دیا ہے؟ اس کا آغاز انھوں نے دلالتِ فصل سے کیا ہے۔ اس سے یہ خیال ہوتا ہے کہ وہ یہاں دوسرے اہلِ بلاغت کی طرح اس سے متعلق گفتگو کریں گے، لیکن انہوں نے جو طرز اختیار کیا ہے وہ ذوق اور ادب کی روح سے زیادہ قریب ہے۔ وہ لکھتے ہیں: ''اگر سرسری طور پر کلام کو بیان کیا جائے تو بعض معانی سے غفلت ہوسکتی ہے، بلکہ بعض اوقات معانی میں تغیر رونما ہوجاتا ہے۔ مثلاً سورۂ یٰسین کی آیات ۲۰۔۲۱: یَا قَوْمِ اتَّبِعُوا الْمُرْسَلِيْنَ۔ اتَّبِعُوا مَن لاَّيَسْأَلُكُمْ أَجْراً۔ میں لفظ 'مرسلین' سے اگر واقفیت نہ ہوتو دلیل میں جوزور موجود ہے اسے صحیح طور پر نہیں سمجھا جا سکتا۔[۴۴]

مولانا فراہی نے اس بحث میں فصل اور اس کے مواقع کا تذکرہ نہیں کیا ہے، بلکہ ان دو آیات کریمہ کا تذکرہ کیا ہے جن کے درمیان فصل واقع ہے۔ اس طور سے کہ اللہ تعالیٰ نے لفظ 'اتَّبِعُوا' کا اعادہ کیا ہے۔ فصل و وصل کی اس بحث میں نئی بات یہ ہے کہ مولانا فراہی نے اسے خیال سے مربوط کیا ہے۔ لکھتے ہیں: ''پھر فصل میں دو مفہوموں کے درمیان خیال کو پل کی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ اگر تم ان دونوں میں وصل پیدا کردو تو خیال کے لیے ان کے درمیان کوئی راہ نہیں پیدا ہوسکتی''۔[۴۵]

مولانا فراہی نے 'حظ السامع' کے عنوان سے ایک بحث کی ہے۔ اس کا مطلب ہے سامع کی توجہ ملحوظ رکھنا۔ اسی قبیل سے یہ مباحث بھی ہیں: استفہام، تا کہ سامع متنبہ ہو، سکوت، تا کہ وہ آرام حاصل کرے، حذف، تا کہ سامع بذات خود متکلم

بن جائے اور اپنی عقل کا استعمال کرے ۔ رغبت اور نفرت پیدا کرنے والی چیزیں، التفات، تا کہ جس چیز کا اسے احساس ہوا ہے اس کی طرف اس کی توجہ مبذول ہو، تمثیل، تا کہ وہ محسوس کا مشاہدہ کرے اور اپنے خواب سے بیدار ہو جائے ،حرکات کی تبدیلی ہو،خوشی وغم کے جذبات برانگیختہ ہوں ۔یہ دیگر فوائد کے ساتھ سامع کی توجہ حاصل کرنے کے اسباب ہیں ۔ اس کے علاوہ مولانا نے حذف اور اس کے مواقع، دلیل، ترتیب ،مقابلہ، استثنائ،موقع سے فائدہ اٹھانا،مجاز ،کنایہ،مختلف زمانوں میں مجاز کی دلالت،غیب کی زبان ،اشارہ اور تعریض وغیرہ سے بحث کی ہے ۔ یہ بلاغت کی وہ قسمیں ہیں جن کی انھیں تالیف کی راہ میسر ہوئی ،اگرچہ عربی بلاغت کے کارواں میں ان میں سے بعض بہت بعد میں شامل ہوئی ہیں ۔

کتاب کے آخر میں متفرق مباحث ہیں،مثلاً کلام کو اس کی راہ سے پھیرنا، جملۂ معترضہ، اچھے اور برے کلام میں فرق کرنے میں غلطی کے اسباب، بلاغت کی روح اور اس کا راز، بلاغت و اعجاز کا کمال ،کلامِ عرب کی اساس، عربوں کا اخلاق (عقلی اور کلامی قوتیں) عربوں کا فی البدیہ کلام،خطبوں کی آواز،عربوں کا طریقۂ نقد، فواصل، قوافی وغیرہ۔ ان میں سے بعض موضوعات وہ ہیں جو عربی بلاغت میں زیر بحث نہیں آئے ہیں ۔

مشرق اسلامی کے ایک مسلم مؤلف کی تالیف کردہ اپنی نوعیت کی منفرد کتاب کا یہ ایک سرسری جائزہ ہے ۔بلادعربیہ تک اس کتاب کی رسائی نہیں ہوسکی ، ورنہ بیسویں صدی عیسوی میں بلاغت کے درس وتدریس کو ایک نئی جہت ملتی ۔مولانا فراہی کے بلاغی نظریات اس کتاب میں بالکل واضح ہیں اور وہ درج ذیل ہیں :

(۱) عربوں پر فخر، کیوں کہ ان کے خیال میں وہ ذہین ترین قوم ہے ۔

(۲) عربی زبان سے شغف، جو اپنی بے شمار خصوصیات کی بنا پر دوسری زبانوں سے ممتاز ہے، بالخصوص یونانی زبان سے،جس سے ارسطو نے شعر کا مفہوم اور نظریۂ محاکاۃ اخذ کیا ہے ۔

(۳) عربوں کی بلاغت سے ان کی وابستگی اور عجمیوں کی بلاغت سے کنارہ کشی۔
(۴) فصیح وبلیغ عربی اسلوب کا اہتمام۔
(۵) عربی بلاغت کی اہم ترین کتابوں، اسی طرح ارسطو کی کتب اور عربی شاعری سے واقفیت۔

اس کتاب کی اہم ترین خصوصیات درج ذیل ہیں:
(۱) بلاغت کے مباحث کو دو حصوں (قسم عمومی اور قسم خصوصی) میں تقسیم کیا گیا ہے۔ یہ ایک نئی تقسیم ہے جس سے عربی بلاغت کی طویل تاریخ ناواقف ہے۔
(۲) بلاغت کو نقد سے مربوط کیا گیا ہے اور اسے احکامِ نقد میں کسوٹی بنایا گیا ہے۔
(۳) مباحث کی پیش کش اور تجربہ میں ادبی رجحان کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔
(۴) مختلف مسائل میں مؤلف نے خاص آراء پیش کی ہیں۔ مثلاً ارسطو کے نظریۂ محاکاۃ کا رد، عبدالقاہر جرجانی پر تنقید، بلاغتِ عرب اور بلاغتِ عجم کے درمیان تفریق، شعر اور خطابت میں تفریق، اور دیگر بہت سی آرائ۔
(۵) نقد سے متعلق بعض اہم مباحث کو بلاغت سے مربوط کیا ہے۔
(۶) کتاب کا اسلوب مباحث کو پیش کرنے اور ان کا تجزیہ کرنے میں بہت واضح ہے۔

مذکورہ تفصیل سے کتاب کی اہمیت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ اس میں مذکور مباحث وآراء میں غور وفکر کے ذریعہ بلاغت ونقد کے میدان میں فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔

حواشی ومراجع

۱۔ مفردات القرآن للفراہی، تحقیق ڈاکٹر محمد اجمل ایوب اصلاحی، طبع سعودیہ، ص ۲۶
۲۔ حوالۂ سابق
۳۔ جمہرۃ البلاغۃ، الدائرۃ الحمیدیۃ، سرائے میر، اعظم گڑھ
۴۔ حوالۂ سابق ۵۔ حوالۂ سابق، ص ۲ ۶۔ حوالۂ سابق، ص ۳
۷۔ دلائل الاعجاز، طبعۃ محمود محمد شاکر، ص ۵۴۷

۸۔ مفتاح العلوم، السکاکی، طبع ۱۹۳۷ئ، ص۱۹۶

۹۔ جمھرۃ البلاغۃ، ص ۳

۱۰۔ عبدالقاہر جرجانی کی تصانیف کے لیے ملاحظہ کیجیے: عبدالقادر الجرجانی، بلاغتہ ونقدہ، الدکتور احمد مطلوب، ص ۲۵۔ ۴۷

۱۱۔ جمھرۃ البلاغۃ، ص ۴ ۱۲۔ حوالۂ سابق

۱۳۔ حوالۂ سابق، ص ۴۔ ۵ ۱۴۔ حوالۂ سابق، ص ۵

۱۵۔ حوالۂ سابق، ص ۶ ۱۶۔ حوالۂ سابق، ص ۷

۱۷۔ الکامل، المبرد، طبعۃ زکی مبارک، ۳/ ۸۱۸

۱۸۔ حوالۂ سابق، ۲/ ۷۴۰

۱۹۔ جمھرۃ البلاغۃ، ص ۲۰۸۔ ۲۰۔ حوالۂ سابق، ص ۹۔ ۱۰ ۲۱۔ حوالۂ سابق، ص ۱۰

۲۲۔ حوالۂ سابق، ص ۱۱ ۲۳۔ حوالۂ سابق، ص ۱۳ ۲۴۔ حوالۂ سابق،

۲۵۔ حوالۂ سابق، ص ۱۶

۲۶۔ مفردات القرآن للفراہی، مقدمہ از اجمل ایوب اصلاحی، ص ۱۴، ۲۲، ۲۹

۲۷۔ حوالۂ سابق، ص، ۲۳

۲۸۔ جمھرۃ البلاغۃ، ص ۱۷۔ ۱۸ ۲۹۔ حوالۂ سابق، ص ۱۸۔ ۱۹

۳۰۔ حوالۂ سابق، ص ۲۰ ۳۱۔ حوالۂ سابق، ص ۲۱

۳۲۔ حوالۂ سابق، ص ۲۴ ۳۳۔ حوالۂ سابق، ص ۲۶

۳۴۔ الخصائص، ابن جنی، ۲/ ۱۴۵ و ما بعد

۳۵۔ المثل السائر، ابن الاثیر، ۲/ ۶۰ ۳۶۔ دلائل الاعجاز، ص ۵۲۲

۳۷۔ جمھرۃ البلاغۃ، ص ۳۱ ۳۸۔ حوالۂ سابق، ص ۳۲

۳۹۔ حوالۂ سابق، ص ۳۹ ۴۰۔ حوالۂ سابق، ص ۴۰

۴۱۔ حوالۂ سابق، ص ۴۶ ۴۲۔ حوالۂ سابق، ص ۴۷

۴۳۔ ملاحظہ کیجیے اسرار البلاغۃ، ص ۶۲

۴۴۔ جمھرۃ البلاغۃ، ص ۶۲ ۴۵۔ حوالۂ سابق،

☆☆☆

تعارف وتبصرہ

اوراقِ سیرت   مولانا سید جلال الدین عمری

ناشر: مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی۔ ۲۵، ۲۰۱۵ئ، صفحات: ۳۸۴، قیمت۔/ ۲۵۰ روپے

زیرِ نظر کتاب کے مصنفِ گرامی مولانا سید جلال الدین عمری ممتاز عالمِ دین اور معروف محقق و مصنف ہیں، جن کی تصنیفات اسلامیات کے مختلف پہلوؤں پر تحقیق و تصنیف کا اعلیٰ معیار پیش کرتی ہیں اور دینی و علمی حلقوں میں کافی مقبول ہیں۔ ہماری روزمرہ زندگی میں رہ نمائی کے لیے دو ہی بنیادی مآخذ ہیں: قرآن کریم اور سنت نبوی ﷺ۔ مولانا کے سلسلۂ تصنیفات وتالیفات میں 'تجلیاتِ قرآن' کے ظہور کے بعد 'اوراقِ سیرت' کی جلوہ گری متوقع اور فطری ترتیب کے عین مطابق ہے۔

کتاب کا ایک مفید و نادر پہلو (جو عام طور پر اردو کتابوں میں نہیں ملتا) 'اوراقِ سیرت کے مآخذ' کے عنوان سے ان مآخذ کا تعارف ہے جن سے اس کی تالیف میں استفادہ کیا گیا ہے۔ اس کے تحت قرآن و حدیث کے علاوہ پانچ اولین سیرت نگاروں (واقدی، ابن اسحٰق، ابن سعد، ابن ہشام اور طبری) کے بارے میں ضروری معلومات فراہم کی گئی ہیں، جن کی تصنیفات کو مؤلفِ گرامی کی رائے میں سیرتِ نبوی کے باب میں بنیادی مآخذ کی حیثیت حاصل ہے، لیکن اسی کے ساتھ انھوں نے یہ بھی واضح کیا ہے کہ ان میں قوی وضعیف، معتبر وغیر معتبر، ہر طرح کی روایات جمع ہوگئی ہیں، اس لیے ان سے سیرت کے لیے مواد اخذ کرتے وقت بڑی احتیاط کی ضرورت ہے (ص ۲)۔ مولانا نے خود کتبِ احادیث سے سیرت کے واقعات نقل کرتے وقت جا بجا متعلقہ حدیث کی فنی حیثیت پر اظہار خیال کیا ہے، اسی طرح کتبِ سیرت سے استفادہ کرتے وقت بعض مقامات پر ان کی روایات کے پایۂ استناد پر تبصرہ کیا ہے۔ ہر باب کے مباحث میں قرآن مجید کو اصل ماخذ کی حیثیت سے استعمال کرنے کے علاوہ احادیث اور سیرت کی امہات کتب سے بھر پور استدلال کیا گیا ہے۔ اس طرح اس کتاب کے مشتملات مستند مآخذ پر مبنی ہیں۔ اس ضمن میں خاص بات یہ کہ اگر کسی واقعہ

کے وقوع کے سنہ یا تاریخ یا خود نفسِ واقعہ کے متن کے بارے میں روایات یا کتب سیرت کے بیانات میں اختلاف پایا جاتا ہے تو مصنفِ گرامی نے حاشیہ میں دیگر (اختلافی) روایات/ بیانات کی صراحت ان کے مآخذ کی نشان دہی کے ساتھ کی ہے، پھر اپنی ترجیحی رائے واضح کردی ہے۔اس سے نہ صرف صاحبِ کتاب کا تحقیقی ذوق عیاں ہے، بلکہ کتبِ احادیث اور سیرت کے مآخذ پر گہری نظر بھی ثابت ہوتی ہے۔اس طرح کی بحثوں سے کتاب کے مواد کی جوقدرو قیمت بڑھ گئی ہے وہ اپنی جگہ ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ پیشِ نظر کتاب سیرت نبوی ﷺ کے مختلف پہلووں پر اپنے مشتملات کے اعتبار سے بڑی اہمیت ووقعت کی حامل ہے۔ان سب کے علاوہ اس کا ایک اور لائق توجہ پہلو اس کا معیارِ تحقیق اور منہج تالیف ہے۔اس پہلو سے نوجوان محققین (بالخصوص احادیث و روایات کے حوالے سے کسی موضوع پر تحقیقی کام کرنے والے اسکالرس) کے لیے اس میں تحقیق وتصنیف کے بہت سے عمدہ نمونے موجود ہیں۔ان میں سے کچھ کا ذکر یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے:

۱۔کتبِ احادیث وسیرت یا دوسرے مآخذ سے جو کچھ نقل کیا گیا ہے، حواشی میں ان کے مکمل حوالے دیے گئے ہیں۔کتبِ حدیث کا حوالہ دینے میں بعض اوقات صرف کتاب کا نام اور بعض دفعہ اس کے ساتھ حدیث نمبر درج کیا جاتا ہے۔زیرِ مطالعہ تالیف میں ماخذ کے نام کے ساتھ کتاب اور باب کی سرخی نقل کی گئی ہے، جس سے متعلقہ ماخذ سے رجوع کرنا آسان ہوتا ہے۔مثلاً صحیح بخاری، کتاب العلم، باب قول النبی ﷺ رب مبلغ اوعی من السامع (ص ۲۷۰، حاشیہ نمبر ۲)۔

۲۔اگر کسی حدیث یا روایت کے الفاظ میں اختلاف پایا جاتا ہے تو ان سب کا ذکر متعلقہ ماخذ کے حوالے کے ساتھ کیا گیا ہے۔شاہ قیصر کے نام مکتوبِ گرامی کو پہنچانے والے کو اجر ملنے کے ضمن میں ایک حدیث میں 'وان لم یقبل'، دوسری روایت میں 'وان لم یَصِل' اور تیسری میں 'وان لم یُقتَل' کے الفاظ آئے ہیں۔ان سب کا ذکر ان کے معانی کی وضاحت (اگر وہ اسلام نہ قبول کرے، چاہے سفیر ہرقل تک نہ پہنچ

پائے، اگر سفیر کو اس مہم میں شہادت نہیں نصیب ہوتی اور وہ صحیح سالم واپس آجاتا ہے) کے ساتھ کیا گیا ہے اور ان روایتوں کے آخذ کی نشان دہی بھی کی گئی ہے۔ (ص ۲۹۲ ۔ ۲۹۳، حاشیہ نمبر۱)

۳۔کسی واقعہ یا معاملہ کی تائید میں نقل کردہ حدیث یا روایت میں ضعف یا سقم پایا جاتا ہے یا محدثین محولہ حدیث کے کسی راوی کے پایۂ استناد کے بارے میں مختلف الرآی ہیں تو مؤلف گرامی حاشیہ میں ان سب کی وضاحت کر دیتے ہیں۔مثال کے طور پر باب 'رسول اکرم ﷺ کے دعوتی مکاتیب' میں ایک جگہ ایک حدیث نقل کرنے کے بعداس سے متعلق حاشیہ میں واضح کرتے ہیں کہ: ''اس کے ایک راوی اسماعیل بن عیاش گو حدیث کے بہت بڑے عالم تھے،لیکن روایتِ حدیث میں وہ عام طور پر ضعیف سمجھے جاتے ہیں۔بعض محدثین نے انھیں ثقہ بھی قرار دیا ہے۔ امام احمد اور حافظ ابن معین وغیرہ نے کہا ہے کہ شامیوں سے ان کی روایات قابلِ اعتماد ہیں، البتہ اہلِ حجاز سے وہ کم زور روایات نقل کرتے ہیں۔حافظ ابن حجر نے یہ روایت نقل کی ہے،لیکن اس کے ضعف کا ذکر نہیں کیا ہے۔'' (ص ۲۸۶، حاشیہ نمبر۱)۔

۴۔اگر کسی واقعہ سے متعلق جزئیات میں سیرت نگاروں کے بیانات میں اختلاف پایا جاتا ہے تو اس کی وضاحت کرتے ہوئے مصنفِ گرامی اپنی ترجیحی رائے بھی ظاہر کرتے ہیں۔حبشہ کی طرف دو بار ہجرت ہوئی۔سیرت حلبیہ کے بیان کے مطابق دوسری ہجرت شعبِ ابی طالب میں محصور ہونے کے بعد (یعنی تقریباً چار برس بعد) ہوئی،لیکن واقدی، ابن سعد اور ذہبی کے بیانات سے مترشح ہوتا ہے کہ پہلی ہجرت سے واپسی کے کچھ ہی دنوں بعد یا فوراً ہی شروع ہوگئی تھی۔ ان روایتوں کو نقل کرنے بعد مؤلفِ محترم اپنی رائے یہ ظاہر کرتے ہیں کہ ''یہی بات صحیح معلوم ہوتی ہے۔ مکہ کی صورتِ حال دیکھنے کے بعد جلد ہی حبشہ روانگی شروع ہو گئی ہوگی۔ اس لیے کہ مہاجرین کی واپسی کے بعد کفارِ مکہ نے پھر انھیں اپنے ظلم وستم اور اذیتوں کا نشانہ بنانا شروع کر دیا تھا۔'' (ص ۲۱۴، حاشیہ نمبر۲)

۵۔ اگر کسی واقعہ کے بارے میں اختلافِ روایات کی وجہ سے کچھ تضاد نظر آتا ہے تو ان میں تطبیق پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مثال کے طور پر حضرت عمرؓ کے اسلام لانے کے واقعہ کے ضمن میں یہ روایت مشہور ہے کہ آپؐ نے حضرت عمرؓ اور ابو جہل دونوں سے متعلق دعا کی تھی کہ ان میں سے کسی ایک کے ذریعہ اسلام کو تقویت حاصل ہو، لیکن مستدرک حاکم میں مذکور حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کی ایک روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپؐ نے صرف حضرت عمرؓ کے حق میں دعا کی تھی۔ ان روایتوں کو نقل کرنے کے بعد ان میں تطبیق دیتے ہوئے مصنف گرامی لکھتے ہیں: ''ہوسکتا ہے، رسول اللہ ﷺ نے پہلے حضرت عمرؓ اور ابو جہل دونوں کے لیے اور بعد میں صرف حضرت عمرؓ کے حق میں دعا فرمائی ہو۔'' (ص ۱۸۰۔۱۸۱)

۶۔ کسی معاملہ یا واقعہ کی تفصیلات پڑھ کر قاری کے ذہن میں جو سوالات پیدا ہوسکتے ہیں، مصنفِ محترم خود ممکنہ سوال/سوالات اٹھا کر ان کا تشفی بخش جواب دیتے ہیں۔ اس سے متعلقہ بحث کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے۔ مثال کے طور پر ملاحظہ کیجیے 'رسول اللہ ﷺ کے دعوتی مکاتیب' والا باب۔

۷۔ سیرت کے کسی پہلو یا واقعہ کے مطالعہ کے ضمن میں اپنے بیان کی تائید میں خاص ماخذ کے ذکر کے ساتھ مصنفِ محترم یہ بھی واضح کرتے ہیں کہ یہ واقعہ یا معاملہ فلاں کتاب میں مزید تفصیل کے ساتھ یا کچھ مختلف انداز میں زیرِ بحث آیا ہے، وہاں دیکھا جاسکتا ہے۔ (مثلاً ملاحظہ کیجیے ص ۱۰۷، حاشیہ نمبر ۱، ص ۱۱۲، حاشیہ نمبر ۳، ص ۱۴۲، حاشیہ نمبر ۱، ص ۱۶۱، حاشیہ نمبر ۱، ص ۱۸۷، حاشیہ نمبر ۱، ص ۳۰۷، حاشیہ نمبر ۱)۔

۸۔ اس کتاب میں مؤلف گرامی صرف سیرت کے واقعات ہی بیان کرنے پر اکتفا نہیں کرتے، بلکہ ان کا گہرا تجزیہ بھی کرتے ہیں اور ان سے قیمتی نکات اخذ کرتے ہیں۔ بعض اوقات عصر حاضر میں ان کی معنویت بے نقاب کرتے ہیں اور موجودہ حالات میں ان سے کیا سبق حاصل کیا جاسکتا ہے؟ اسے واضح کرتے ہیں۔ اس کی ایک مثال ان اسباق میں ملتی ہے جنھیں مصنفِ موصوف نے چھ سات نکات کی صورت میں ہجرتِ حبشہ کے واقعات

سے اخذ کیا ہے۔ 'رسول اللہ ﷺ کے دعوتی مکاتیب' پر بحث کے آخر میں اس سے نتائج اخذ کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے کہ ''دعوت وتبلیغ کا ذریعہ تقریر ہی نہیں، بلکہ تحریر بھی ہے اور موجودہ دور میں اس کام کے لیے تحریر کی اہمیت اور زیادہ بڑھ گئی ہے۔ اس کے ذریعہ زیادہ وسیع حلقہ تک اسلام کے اصول اور اس کی تعلیمات کی ترسیل کا امکان ہے اور مخاطب کو اس پر غور وفکر کا بہترین موقع ملتا ہے۔(ص ۲۹۰۔۲۹۱) اس طرح کی مزید مثالیں صفحات ۱۹۸ اور ۱۶۳ پر دیکھی جاسکتی ہیں۔

۹۔سیرتِ نبوی ﷺ کے کسی واقعہ سے کوئی فقہی مسئلہ نکلتا ہے تو مؤلفِ محترم نہ صرف اس کی وضاحت کرتے ہیں، بلکہ اس باب میں اگر فقہاء کا اختلاف پایا جاتا ہے تو اس کی صراحت بھی کرتے ہیں۔ مثلاً اصحابِ صفہ کے تعلیمی ومعاشی کوائف سے متعلق باب میں ایک صحابی کا واقعہ بیان کیا گیا ہے کہ انھوں نے آپؐ کے سامنے یہ عرض کیا کہ جن اہلِ صفہ کو وہ قرآن مجید کی تعلیم دیتے تھے ان میں سے ایک نے انھیں ایک کمان تحفہ میں دی ہے، جس سے وہ اللہ کے راستے میں تیر اندازی کریں گے۔ آپؐ نے اس پر ناگواری کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا: ''اگر تم چاہتے ہو کہ آگ کا طوق تمھاری گردن میں ڈال دیا جائے تو اس ہدیہ کو قبول کرلو۔'' حاشیہ میں اس سے ماخوذ فقہی مسئلہ کی وضاحت کرتے ہوئے صاحبِ کتاب نے تحریر کیا ہے: ''فقہاء کے درمیان اس امر میں اختلاف ہے کہ قرآن کی تعلیم پر اجرت لی جا سکتی ہے یا نہیں؟ امام ابوحنیفہؒ اور بعض دوسرے ائمہ نے اسے ناجائز قرار دیا ہے۔ بعض دوسری روایات کی بنیاد پر امام مالکؒ اور امام شافعیؒ اس کے جواز کے قائل ہیں۔ فقہاء احناف میں متاخرین نے یہ محسوس کرکے کہ اگر اجرت نہ دی جائے تو قرآن کی تعلیم متاثر ہوگی، اس کے جواز کا فتویٰ دیا ہے۔ (ص ۳۶۹۔۳۷۰، حاشیہ نمبر۱)

۱۰۔سیرتِ نبوی ﷺ کے واقعات سے دعوتِ دین کے سلسلے میں جو رہ نمائی ملتی ہے، ان سے اسلام کی تبلیغ کے جو اصول وضوابط اخذ ہوتے ہیں اور خاص طور سے موجودہ دور کے دعاۃ ومبلغین کے لیے ان میں جو قیمتی سبق ملتا ہے، مؤلف گرامی نے کتاب میں مختلف مقامات پر ان نکات کو نمایاں کرکے پیش کیا ہے۔(مثلاً ملاحظہ کیجیے ص

۵۸، ۱۴۴۔ ۱۴۵، ۱۶۶، ۱۹۸، ۲۲۷۔ ۲۲۸، ۲۶۲، ۲۷۲، ۲۹۰۔ ۲۹۱، ۳۳۶، ۳۴۱۔ ۳۴۳)۔

۱۱۔ مآخذ کے حوالہ کا اہتمام، ریفرنسنگ کے جدید طریقہ کی پابندی اور اصولِ تحقیق کے مطابق محولہ/منقولہ روایات و بیانات کی چھان بین کے نقطۂ نظر سے زیرِ مطالعہ کتاب تحقیق کا اعلیٰ معیار پیش کرتی ہے، جو مصنف موصوف کی بیش تر تصنیفات و تالیفات کا خاصّہ ہے۔ کتاب میں اس کی مثالیں جا بجا ملتی ہیں۔ سیرت نبوی کے بعض اہم واقعات یا مسائل (کتاب وسنت اساسِ دین ہیں، مواخاتِ مکہ، صلح حدیبیہ کے معاہدہ کی ایک شرط، ہرقل کے نام مکتوبِ گرامی) پر مختصر ابواب کی صورت میں جو تحقیقاتِ عالیہ اس کتاب میں پیش کی گئی ہیں وہ بھی ان حقائق کی شاہد ہیں۔ ان کے علاوہ حبشہ کی جانب مہاجرینِ اول و دوم، حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ مہاجرین حبشہ میں شامل تھے یا نہیں؟ اور اصحابِ صفہ کی تعداد کے بارے میں مصنفِ گرامی نے جس باریک بینی سے پانچ چھ مآخذ کی روایات کا استقصاء کر کے اپنی تحقیقات پیش کی ہیں وہ بھی ان کے اعلیٰ تحقیقی ذوق کے بہترین نمونے ہیں۔ (ملاحظہ کیجیے ص ۲۰۹، ۲۱۴۔ ۲۱۵، ۳۶۳۔ ۳۶۴)

('اوراقِ سیرت' پر راقم کا تفصیلی تبصرہ ماہ نامہ زندگی نو، ستمبر ۲۰۱۶ء میں شائع ہو رہا ہے۔ یہاں اس کے بعض علمی اور تحقیقی پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا ہے۔)

(ظفر الاسلام اصلاحی)

دورِ جدید میں سیرت نگاری کے رجحانات مرتب: مبشر حسین/ عبدالکریم عثمان

ناشر: قومی مرکز مطالعۂ سیرت ولائبریری، ادارہ تحقیقات اسلامی، بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، اسلام آباد

سنہ اشاعت ۲۰۱۵ئ ،صفحات: ۷۵۰، قیمت درج نہیں

برصغیر ہند و پاک کے علمی و تحقیقی اداروں میں بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی اسلام آباد (پاکستان) کا 'ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی' اپنی منفرد شناخت رکھتا ہے۔ علوم اسلامی کے مختلف پہلوؤں میں اس کی معیاری طبع زاد اور ترجمہ شدہ کتابوں کو علمی حلقوں میں

بڑی مقبولیت حاصل ہے۔ انگریزی میں Islamic studies ،عربی میں الدراسات الاسلامیة اوراردومیں 'فکرونظر' کے نام سے اس کے سہ ماہی مجلّات بڑے قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ قومی اور بین الاقوامی سطح پر مختلف علمی، تاریخی، ثقافتی اور دینی موضوعات پر سمیناروں، ورک شاپس اور کانفرنسوں کا انعقاد اس ادارے کی شان دار علمی روایت ہے۔ اس کی جانب سے برصغیر میں مطالعۂ قرآن، برصغیر میں مطالعۂ حدیث، امام ابو حنیفہ: حیات،فکر اور خدمات، اجتماعی اجتہاد: تصور، ارتقاء اور عملی صورتیں، جنوبی ایشیا میں اسلامی قانونی فکر اور ادارے' جیسے موضوعات پر علمی اجتماعات منعقد ہوچکے ہیں۔٢٦ تا ٢٨ / مارچ ٢٠١١ء میں اس نے' دورِجدید میں سیرت نگاری کے رجحانات' کے موضوع پر ایک بین الاقوامی کانفرنس کا انعقاد کیا تھا،جس میں دنیا بھر سے سو(١٠٠) سے زائد اصحابِ علم نے شرکت کی تھی اور انگریزی،عربی اور اردو میں مقالات پیش کیے تھے۔ ہندوستان سے آٹھ رکنی وفد(جس میں راقم الحروف بھی شامل تھا)اس سمینار میں شریک ہوا تھا اور پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی نے وفد کی قیادت کی تھی۔انھوں نے بجا طور پر لکھا ہے کہ ''مذکورہ بالا سمینار اپنے نظم وضبط اور حسن و جمالِ ترتیب کا ایک شاہ کار تھا۔ میزبانی اور مہمان نوازی کے اعتبار سے وہ معیارِ پاک پر کھرا تھا۔ بلا خوفِ تردید عرض ہے کہ سیرتِ نبوی کے جدید رجحانات پر یہ سمینار سیرت نگاری کا ایک سنگِ میل قائم کر گیا ہے۔سیرت نگاری کی ایسی تاب ناک جہات نے علم و تحقیق اور نگارش وپیش کش کے نئے باب رقم کیے ہیں۔ یہ دراصل ارضِ پاک میں سیرت نگاری کے فروغ وارتقاء کا ایک مظہر تھا۔'' (تقدیم،ص x)

کانفرنس میں اردو کے باون(٥٢) مقالات پیش کیے گئے تھے۔انہیں تجزیہ وتحلیل کے لیے ایک کمیٹی کے سپرد کیا گیا،جس نے بہت باریکی سے ان کا جائزہ لے کر ستائیس(٢٧) مقالات کو اشاعت کے لیے منتخب کیا۔انہی کا مجموعہ زیرنظر کتاب کی صورت میں شائع کیا گیا ہے۔ ان مقالات کو پانچ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے : (١) سیرت نگاری کے اصول ومصادر(٢) سیرت نگاری اورغیر مسلم(٣) سیرت نگاری

کے اسالیب ومناہج (۴) سیرت نگاری کے تاریخی وعلاقائی جائزے (۵) چند اہم کتبِ سیرت: تعارفی وتنقیدی مطالعہ۔ یوں تو اس مجموعہ میں شامل تمام ہی مقالات معیاری ہیں اور اعلیٰ تحقیقی اسلوب میں لکھے گئے ہیں، لیکن خصوصیت سے یہ مقالات لائقِ استفادہ ہیں: سیرتِ نبوی کے مآخذ پر جدید اردو تحقیقات (پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی) سیرت نگاری میں صحت واستناد کے جدید مباحث (حافظ مبشر حسین) سیرت نگاری میں ہند واہلِ علم کا حصہ (ڈاکٹر ضیاء الدین ملک فلاحی) برصغیر کا مسیحی سیرتی ادب: تعارفی وتجزیاتی مطالعہ (ڈاکٹر سید عزیز الرحمن)۔ راقم الحروف کا مقالہ 'برصغیر ہند میں بچوں کا سیرتی ادب (اردو زبان میں)' بھی اس مجموعہ میں شامل ہے۔

سیرتِ نبوی کے جدید مطالعات میں، امید ہے، اس مجموعۂ مقالات کو اہمیت دی جائے گی اور اس سے بھرپور استفادہ کیا جائے گا۔ معیاری کمپوزنگ اور طباعت پر فاضل مرتبین اور دیگر معاونین مبارک باد کے مستحق ہیں۔ (محمد رضی الاسلام ندوی)

اشاریۂ 'برہان' دہلی

محمد شاہد حنیف

ناشر: اوراق پارینہ پبلشرز، لاہور، ملنے کا پتہ: کتاب سرائے، اردو بازار، لاہور

سنہ اشاعت: ۲۰۱۶، صفحات: ۳۷۲ (بڑی تقطیع)، قیمت -/۸۰۰ روپے (پاکستانی)

تقسیمِ ملک سے قبل اردو زبان میں برصغیر سے نکلنے والے علمی رسائل میں ماہ نامہ معارف اعظم گڑھ اور ماہ نامہ برہان دہلی کو غیر معمولی شہرت حاصل ہے۔ اول الذکر رسالہ دار المصنفین کا ترجمان ہے، ۱۹۱۶ء سے نکلنا شروع ہوا اور اب تک پابندی سے نکل رہا ہے، جب کہ مؤخر الذکر ندوۃ المصنفین کا ترجمان تھا، ۱۹۳۸ء سے اس کی اشاعت کا آغاز ہوا اور ۲۰۰۱ء میں وہ 'مرحوم' ہو گیا۔ بہت پہلے دونوں رسائل کا اشاریہ ڈاکٹر شائستہ خاں نے تیار کیا تھا۔ بعد میں معارف کے دو (۲) اور اشاریے منظر عام پر آئے: ایک ڈاکٹر سہیل شفیق، استاد شعبۂ اسلامی تاریخ، کراچی یونی ورسٹی کا، جس میں ۲۰۰۵ء تک کے مضامین کا احاطہ کیا گیا تھا اور دوسرا ڈاکٹر جمشید احمد ندوی، استاد شعبۂ

عربی، بمبئی یونی ورسٹی کا، جو ۲۰۱۱ء تک کے مضامین پر مشتمل ہے۔ ماہ نامہ برہان کے مکمل اشاریے کی ضرورت باقی تھی، جو الحمدللہ اب پوری ہوسکی ہے۔

ندوۃ المصنفین دہلی کے بانیوں میں مفتی عتیق الرحمن عثمانیؒ، مولانا حفظ الرحمن سیوہارویؒ اور مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ شامل ہیں۔ مولانا اکبر آبادی ماہ نامہ برہان کے اجراء کے وقت سے اپنی وفات تک اڑتالیس سال (۴۸) اس کے مدیر رہے۔ انھوں نے عصری اور دینی دونوں طرح کی جامعات سے تعلیم حاصل کی تھی، پھر طویل عرصہ تک علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے شعبۂ دینیات (سنّی) میں تدریس و انتظام کی خدمت انجام دی تھی۔ ان کے قلم سے متعدد وقیع تصانیف نکلی ہیں۔ ان کی زیر ادارت 'برہان' نے ترقی کی منزلیں طے کیں۔ مولانا کے اداریے 'نظرات' کے عنوان سے شائع ہوتے تھے، جن میں وہ بڑی جرأت اور بے باکی سے قومی اور بین الاقوامی مسائل پر اظہارِ خیال کرتے تھے۔ وفیات اور تبصرۂ کتب بھی اس رسالہ کے مستقل کالم تھے، جو مولانا کے قلم سے ہوتے تھے۔ ملک کے مشاہیر اصحابِ علم اس کے قلمی معاونین میں شامل تھے۔ مولانا اکبر آبادی کے انتقال کے بعد سولہ (۱۶) سال یہ رسالہ مزید نکلتا رہا اور متعدد حضرات نے اس کی ادارت کی، لیکن اس کی سابقہ شان باقی نہ رہ سکی، یہاں تک کہ مارچ اپریل ۲۰۰۱ء کا مشترکہ شمارہ نکلنے کے بعد یہ ہمیشہ کے لیے موقوف ہو گیا۔

اشاریہ سازی کے میدان میں جناب محمد شاہد حنیف صاحب کو یدِ طولیٰ حاصل ہے۔ انہوں نے اب تک پاکستان کے تقریباً پچاس (۵۰) علمی، دینی اور ادبی رسائل کے اشاریے تیار کیے ہیں۔ برہان کا اشاریہ انہوں نے موضوعاتی اعتبار سے مرتب کیا ہے۔ مقالات کے علاوہ انھوں نے اداریوں، مکتوبات، تبصرۂ کتب اور شاعری وغیرہ کو بھی موضوعات کے تحت درج کیا ہے، تاکہ کسی محقق کے لیے اس رسالے میں شائع شدہ ہر طرح کے مواد تک رسائی آسان ہوجائے۔ آخر میں مصنف وار اشاریہ بھی مرتب کیا گیا ہے اور وہاں ہر مضمون نگار کے مقالات، تراجم اور تبصروں

کے علاوہ اگر اس کی کسی کتاب پر تبصرہ ہوا ہے تو اس کا بھی ذکر کر دیا گیا ہے، تاکہ اس کی تمام نگارشات ایک نظر میں سامنے آ جائیں۔

ابتداء میں ڈاکٹر انوار احمد بگوی، سرپرست ماہ نامہ شمس الاسلام بھیرہ، پروفیسر محمد انس حسان، جہانیاں، ڈاکٹر ہمایوں عباس شمس، ڈین شعبۂ علوم اسلامیہ، جی سی یونی ورسٹی فیصل آباد اور پروفیسر سید شبیر حسین زاہد، گورنمنٹ کالج ننکانہ کے قلم سے تقاریظ شامل ہیں، جن میں اشاریہ سازی کی تاریخ، ماہ نامہ برہان کا تعارف اور اشاریہ نگار کی محنت کی ستائش کی گئی ہے۔

امید ہے، علمی حلقوں میں فاضل مرتب کی محنت کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا اور علم و تحقیق سے وابستہ حضرات اشاریہ سے بھرپور استفادہ کریں گے۔

(م ۔ ر)

خبرنامہ ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی (۶۰)

☆ یہ خبر علمی حلقوں اور خاص طور پر قارئینِ تحقیقات اسلامی کے درمیان بڑے افسوس کے ساتھ سنی جائے گی کہ مولانا سلطان احمد اصلاحی کا ۲۸۔۲۹/مئی ۲۰۱۶ء کی درمیانی شب میں حرکتِ قلب بند ہوجانے سے انتقال ہوگیا۔ وہ ۶۵/ برس کے تھے۔ مدرسۃ الاصلاح سرائے میر، اعظم گڑھ سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد مولانا ۱۹۷۲ء میں ادارۂ تحقیق آ گئے تھے اور تصنیفی تربیت حاصل کرنے کے بعد یہیں بہ حیثیت محقق وابستگی اختیار کرلی تھی۔ چھتیس (۳۶) برس ادارہ سے وابستہ رہنے کے بعد وہ ۲۰۰۸ء میں اس سے سبک دوش ہوگئے تھے اور 'ادارۂ علم و ادب' کے نام سے ذاتی ادارہ قائم کرکے آزادانہ مطالعہ وتحقیق میں مصروف تھے۔ ان کی تصانیف کی تعداد تین درجن سے زائد ہے، جن میں سے 'مذہب کا اسلامی تصور، مشترکہ خاندانی نظام اور اسلام اور آزادئ فکر ونظر اور اسلام' ادارۂ تحقیق سے اور بقیہ مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز نئی دہلی اور دیگر مکتبوں سے شائع ہوئیں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرمائے، ان کی کوتاہیوں سے درگزر فرمائے، انہیں جنت الفردوس میں جگہ دے اور پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ ۲/جون ۲۰۱۶ء کو ادارہ میں ایک تعزیتی نشست ہوئی، جس میں ان کی خوبیوں کو یاد کیا گیا اور ان کے لیے دعائے مغفرت کی گئی۔

☆ مورخہ ۱۰/اپریل ۲۰۱۶ء کو مولانا محمد جرجیس کریمی رکنِ ادارہ نے 'شیعہ سنی اختلاف۔ کچھ قابلِ غور پہلو' کے موضوع پر ایک توسیعی خطبہ پیش کیا۔ انہوں نے بتایا کہ ''یہ اختلافات صدیوں سے ہیں اور ان کو صحیح طور پر نہ سمجھنے کی وجہ سے دونوں فکری دھاروں میں دوریاں پیدا ہوگئی ہیں۔ ضرورت ہے کہ اختلافات کو ان کے صحیح پس منظر میں سمجھا جائے اور اتحاد کی راہیں تلاش کی جائیں۔'' پروگرام کی صدارت پروفیسر سید احتشام احمد ندوی، سابق ڈین فیکلٹی آف ہیومنیٹیز، کالی کٹ یونی ورسٹی نے فرمائی۔ اس موقع پر پروفیسر کنور محمد یوسف امین اور پروفیسر محمد سعود عالم قاسمی نے بھی اظہارِ خیال کیا۔

☆ مورخہ ۱۲/اپریل ۲۰۱۶ء کو علامہ سید سلیمان ندویؒ کے صاحب زادے پروفیسر سید سلمان ندوی (سابق صدر شعبۂ اسلامیات، ڈربن یونی ورسٹی، جنوبی افریقہ) ادارہ تشریف لائے۔ ان کے اعزاز میں ایک علمی نشست کا انعقاد کیا گیا، جس میں اظہارِ

خیال کرتے ہوئے موصوف نے بحث وتحقیق سے متعلق اہم امور پر روشنی ڈالی۔ انہوں نے فرمایا کہ تقسیم ملک کے بعد جماعت اسلامی ہند نے دیگر کاموں کے ساتھ علمی و تحقیقی اور تصنیفی میدان میں بھی گراں قدر خدمات انجام دی ہیں اور اس کی سرپرستی میں یہ تحقیقی وتصنیفی ادارہ بھی مہتم بالشان خدمات انجام دے رہا ہے۔ انہوں نے جماعت کے ذمہ داروں سے اپنے دیرینہ روابط کا بھی تذکرہ کیا۔ اس موقع پر پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی، سابق صدر شعبۂ اسلامک اسٹڈیز، مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ نے بھی اظہارِ خیال کیا۔ سکریٹری ادارہ ڈاکٹر صفدر سلطان اصلاحی نے موقر مہمان کی آمد پر ان کا شکریہ ادا کیا۔

☆ مورخہ ۲۲ رمئی ۲۰۱۶ء کو پروفیسر مسعود احمد (سابق ڈین فیکلٹی آف لائف سائنسز، مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ) نے 'مشرق ومغرب کے دجالی افکار کا تعاقب' کے موضوع پر توسیعی خطبہ پیش کیا۔ انہوں نے فرمایا کہ ''مغرب ومشرق کے دجالی افکار کے حاملین کی توجہ اس بات پر مرکوز ہے کہ قرآن اور رسالت کے سلسلے میں مسلمانوں کو شکوک و شبہات میں مبتلا کردیا جائے، تا کہ مسلمان اپنے دین سے منحرف ہوجائیں۔'' انہوں نے توجہ دلائی کہ امتِ مسلمہ کی نوجوان تعلیم یافتہ نسل ان افکار وخیالات سے شدید متاثر ہے، اس کی طرف توجہ کرنا وقت کی شدید ضرورت ہے۔ پروگرام کی صدارت سینٹر فار اسٹڈیز آن سائنس علی گڑھ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد ذکی کرمانی نے فرمائی۔ سکریٹری ادارہ ڈاکٹر صفدر سلطان اصلاحی نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ پروگرام کی نظامت مولانا کمال اختر قاسمی نے کی۔

☆ مردان، خیبر پختونخواہ (پاکستان) کے جناب سعید الرحمن کو ان کے تحقیقی مقالہ 'پاک وہند کے منتخب اردو اسلامی جرائد کی نمایاں خصوصیات اور بنیادی مناہج کا علمی و تجزیاتی مطالعہ' پر عبدالولی خاں یونی ورسٹی (گارڈن کیمپس) مردان کے شعبۂ علوم اسلامیہ سے پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی گئی ہے۔ موصوف نے ہندوستان کے مجلّات میں 'تحقیقات اسلامی' کا خصوصیت سے تذکرہ کیا ہے اور اس کا تفصیل سے تعارف کرایا ہے۔

☆ کراچی (پاکستان) سے جناب مقبول حسن صاحب، صدر شعبۂ اسلامیات، بحریہ کالج کارساز، کراچی نے 'العروج مجلۃ التحقیق' کے نام سے ایک شش ماہی علمی و تحقیقی مجلّے کا آغاز کیا ہے۔ معاون مدیر تحقیقات اسلامی ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی کو اس کی مجلس ادارت کا اعزازی رکن بنایا گیا ہے۔ ☆☆☆

ISSN:2321-8339

Organ of Idara-e-Tahqeeq-o-Tasneef-e-Islami

Quarterly

TAHQEEQAT-E-ISLAMI
ALIGARH

Vol. 35 No.3

July - September 2015

Editor

Syed Jalaluddin Omari

Asstt. Editor

Muhammad Raziul Islam Nadvi

Nabi Nagar (Jamalpur)، P.O. Box: 93
ALIGARH - 202 002 (INDIA)
www.tahqeeqat.net Email: tahqeeqat@gmail.com

CONTENTS

Abstract of the Articles

Need to Identify Talents and Develop Them

Syed Jalaluddin Omari
President Idara -e-Tahqeeq-o- Tasneef-e- Islami
& Amir Jamaat-e-Islami Hind

In the current term (April 2015 to March 2019) of Jamaat-e-Islami Hind, a new department namely 'Department of Human Resource Development' has been established. A training camp for zonal functionaries of this Department was organised at the Jamaat headquarters. The lecture Ameer-e-Jamaat delivered in the Inaugural Session of this camp is being presented here as an article.

Ameer-e-Jamaat said that Allah has blessed man with many talents and abilities. To identify those talents and abilities and give them right direction is a big task. The Qur'an and Hadith say that every person is born on Fitrah (Nature) but later with the training and influence of parents and other communities he distracts from his Fitrah. Therefore, it is necessary to identify hidden talents of individuals and promote them. If it is done, they will get better opportunities to work and register great progress.

Ameer-e-Jamaat said this is the first camp of Jamaat-e-Islami Hind of its kind. Hope we will try thereby to find out what kinds of talents are there in our associates and how they can be developed. It is evident that this is the first

step. It is only with experience that will tell what results we would reap therefrom.

A Critical Appraisal of Seerah Writing of Shibli

Professor Muhammad Anas Hassan
Government Degree College, Jahanian, Pakistan
anskashmiri@gmail.com

No other Seerah book written in Urdu and other languages in the 20th century C.E. received the fame and popularity as much as Seerat-un-Nabi by Allama Shibli Nomani (d. 1914) did. Its Foreword is particularly important in the sense that therein Shibli has dwelt in detail upon the principles of Seerah writing. This book is unique in style, historic consciousness and awareness as well as comprehensiveness. It provides befitting rejoinders to many objections and allegations levelled by Orientalists against the Prophet (peace and blessings of Allah be to him). However, in certain respects there are some weaknesses also in this book. For example, the author himself has not followed some of the principles of Seerah writing he devised in the Foreword. He has also benefited from certain unauthentic sources. Besides, on some topics he has differed from the collective opinion of the Ummah.

This article analyses both merits and demerits of Shibli's book 'Seerat-un-Nabi' and examples have been cited in support of the argument.

Fuyooz-al Haramain - A Study

Maulana Kaleem Sifat Islahi

Associate, Darul Musannifin Shibli Academy, Azamgarh

Fuyooz-al Haramain holds importance among the works of Shah Waliullah Muhaddith Dehlavi (1762 C.E.). The annotators of his thought have especially taken pains to mention this book. Shah Waliullah wrote this book at the time when he was staying in the Haramain. He has described the secrets and symbols of Sufism and presented the matters, about which, according to him, he was inspired by Allah. In this book he has outlined 47 inner observations. He has explained in easy language some of these observations.

This article discusses the period as well as objective of writing this book, presents a summary of its contents, and in the end details some important discussions. Thus it illustrates the viewpoint of Shah Waliullah on certain aspects of Islamic scholastic theology and Islamic beliefs.

The Concept of Pure Monotheism in Divine Books

Mr.Mohammad Afzal

Lecturer, Government Shah Hussain College,

Township, Lahore, Pakistan

ranaafzalpu@gmail.com

Belief in the oneness of Allah is at the centre of Divine religions. This belief emphasises the right of Allah upon His creatures and this is the cause of all successes in this world and the world hereafter. Due to its significant position,

it is considered superior to all virtues and noble acts. In fact, acceptance of all deeds depends upon this belief.

This belief has been discussed with all the necessary details in three books i.e.Torah(Old Testament), Injeel(New Testament) and the Holy Qur'an, so that their followers refrain from Shirk. Shirk is the opposite of Tawheed and is strictly prohibited in all these religions. Divine religions lay emphasis on the oneness of Allah and it is evident that all prophets gave the same message to their followers and that message was of Tawheed.

This article discusses this significant belief with reference to three Divine books i.e. Torah, Injeel and the Holy Qur'an.

The Ulama & Sufis of Muslim Regime and Islamic Dawah

Dr. Mohammad Shamim Akhter Qasmi
Former Head, Dept. of Islamic Theology,
Aliah University, Kolkata
Mohdshamimakhter.qasmi@yahoo.com

Wheresoever Muslim conquerors went, they used to take with them Ulama, Mashaikh and Sufis who were assigned the duty not only to educate and give moral training to Muslims but also to make Islamic teachings popular among the local people. Ulama and Sufis came to India along with Muslim kings right from the very beginning. Later on too their coming to India continued. They settled down in different parts of the country. Muslims and Non-Muslims all benefited with their knowledge and wisdom. They got influenced with their manners and character as well as asceticism and piety.

As a result, Non-Muslims came to the fold of Islam in large numbers.

This article portrays the services of Ulama and Sufis in the field of Islamic Dawah. In this regard, it throws light on the life and services of Shaikh Ali ibn Usman Hajveri, Shaikh Hasan Saghani, Khwaja Bakhtiyar Kaki, Khwaja Fariduddin Ganj Shakar, Hazrat Nizamuddin Auliya, Shaikh Sharfuddin Yahya Maneri, Shaikh Abdul Haque Muhaddith Dehlavi, Shaikh Ahmed Sirhindi, Shah Waliullah Muhaddith Dehlavi and other Ulama and Sufis.

Maulana Farahi's Jamharatul-Balaghah

Dr. Ahmed Matloob
General Secretary, Al Majma'ul Ilmi Al-Iraqi, Baghdad
Tr. Abu Sa'ad Azmi
Research Scholar, Dept. of Arabic, Aligarh Muslim University, Aligarh

Arabic eloquence had been a subject of interest for ancient men of letters. In the modern age too many books have been written on this subject. Outside Arabia, some people have taken interest in this subject as service to the Qur'an. One distinguished name among them is Maulana Abdul Hameed Farahi (d. 1930). In his book 'Jamharatul-Balaghah' he raised voice in favour of Arabic eloquence instead of A'jami (non-Arabic) eloquence. Unfortunately, the copies of this book went out of stock before they could reach Arab countries.

In this book, Maulana Farahi has criticised Aristotle's viewpoint on eloquence. He was of the view that as a result of being influenced by his (Aristotle's) thought, Arabic eloquence has diverted from its mark. In this regard,

recognising the academic swagger of Imam Abd al-Qahir al-Jurjani, he has criticised it and invited us to set the art of eloquence on the bases of the Qur'an and Arabic eloquence.

This article studies Jamharatul-Balaghah in detail and highlights its merits. However, it also says that some of the criticisms of Maulana Farahi on Abd al-Qahir al-Jurjani do not hold water.

BOOK REVIEWS

1. *Awraq-e-Seerat* (Essays on Seerah) Maulana Syed Jalaluddin Omari, Markazi Maktaba Islami Publishers New Delhi, Pages: 384; Price: IRs. 225/-
   Reviewed by Prof. Zafarul Islam Islahi

2. *Daur-e-Jadid men Seerat Nigari ke Rujhanat*
   (Modern Trends in Seerah Writing) Dr. Mubashshir Husain/Mr. Abdul Kareem Usman, Institue of Islamic Studies, International Islamic University, Islamabad; 2015; Pages: 750; Price not Mentioned.
   Reviewed by Muhammad Raziul Islam Nadvi

3. *Ishariya Burhan Delhi* (Index of articles of Monthly Burhan Delhi) Mohammad Shahid Haneef; Awraq-e-Paarina Publishers, Lahore, 2016; pages 372, Price Pk.800/-
   Reviewed by Muhammad Raziul Islam Nadvi

R.No. 38933/81

Quarterly
Tahqeeqat-e-Islami
Aligarh

Mob. +91-8126677681
Phone: 0571-2902034

July 2016

September 2016

مولانا سید جلال الدین عمری کی مطبوعات

شمار	نام کتاب	قیمت	شمار	نام کتاب	قیمت
۱	تجلیات قرآن	۳۲۵/	۲۲	اوراق سیرت	۲۵۰/
۲	اسلام-انسانی حقوق کا پاسبان	۵۵/	۲۳	خطبات پاکستان	۱۰۰/
۳	غیر اسلامی ریاست اور مسلمان	۲۵/	۲۴	عصر حاضر میں اسلام کے علمی تقاضے	۵۲/
۴	کمزور اور مظلوم اسلام کے سایہ میں	۵/	۲۵	انسان اور اس کے مسائل	۴۰/
۵	صحت و مرض اور اسلامی تعلیمات	۲۵۰/	۲۶	اسلام اور مشکلات حیات	۲۵/
۶	خدا اور رسول کا تصور-اسلامی تعلیمات میں	۱۳۰/	۲۷	خدا کی غلامی-انسان کی معراج	۱۳/
۷	معروف و منکر	۱۸۵/	۲۸	اسلام اور وحدت بنی آدم	۱۶/
۸	اسلام کی دعوت	۲۰۰/	۲۹	اسلام میں خدمت خلق کا تصور	۱۱۰/
۹	غیر مسلموں سے تعلقات اور ان کے حقوق	۱۸۵/	۳۰	انفاق فی سبیل اللہ	۳۵/
۱۰	تحقیقات اسلامی کے فقہی مباحث	۱۰۰/	۳۱	دولت میں خدا اور بندوں کا حق	۱۶/
۱۱	عورت-اسلامی معاشرے میں	۱۸۰/	۳۲	انسانوں کی خدمت-اسلام کی نظر میں	۱۶/
۱۲	مسلمان عورت کے حقوق اور ان پر اعتراضات کا جائزہ	۱۰۰/	۳۳	جماعت اسلامی ہند-پس منظر، خدمات اور طریق کار	۳۵/
۱۳	عورت اور اسلام	۶۰/	۳۴	ہم تحریک اسلامی کے کارکن کیسے بنیں؟	۱۵/
۱۴	اسلام کا عائلی نظام	۹۰/	۳۵	ملک و ملت کے نازک مسائل اور ہماری ذمہ داریاں	۳۲/
۱۵	مسلمان خواتین کی ذمہ داریاں	۳۵/	۳۶	یہ ملک کدھر جا رہا ہے؟	۲۰/
۱۶	قرآن کا نظام خاندان	۱۸/	۳۷	وقت حساب	۱۵/
۱۷	بچے اور اسلام	۱۰/	۳۸	آخرت کے عذاب سے خاندان کو بچایئے	۱۰/
۱۸	اسلام-ایک دین دعوت	۱۰/	۳۹	فقہی اختلافات کی حقیقت	۱۵/
۱۹	دعوت و تربیت-اسلام کا نقطۂ نظر	۵۵/	۴۰	بعض اہم اسلامی اصطلاحات کی تشریح	۱۸/
۲۰	ہندوستان میں اسلام کی [illegible]	۵/	۴۱	سوئے حرم چلا	۳۲/
۲۱	قرآن مجید کا تصور [illegible]	۱۸/	۴۲	دینی علوم کی تدریس	۱۳/

ملنے کے پتے:
۱- ادارہ تحقیق و تصنیف اسلامی، نبی نگر، پوسٹ بکس نمبر: ۹۳، علی گڑھ-۲
۲- مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، ڈی-۳۰۷، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی-۲۵

Design by: Faiz Ahmad